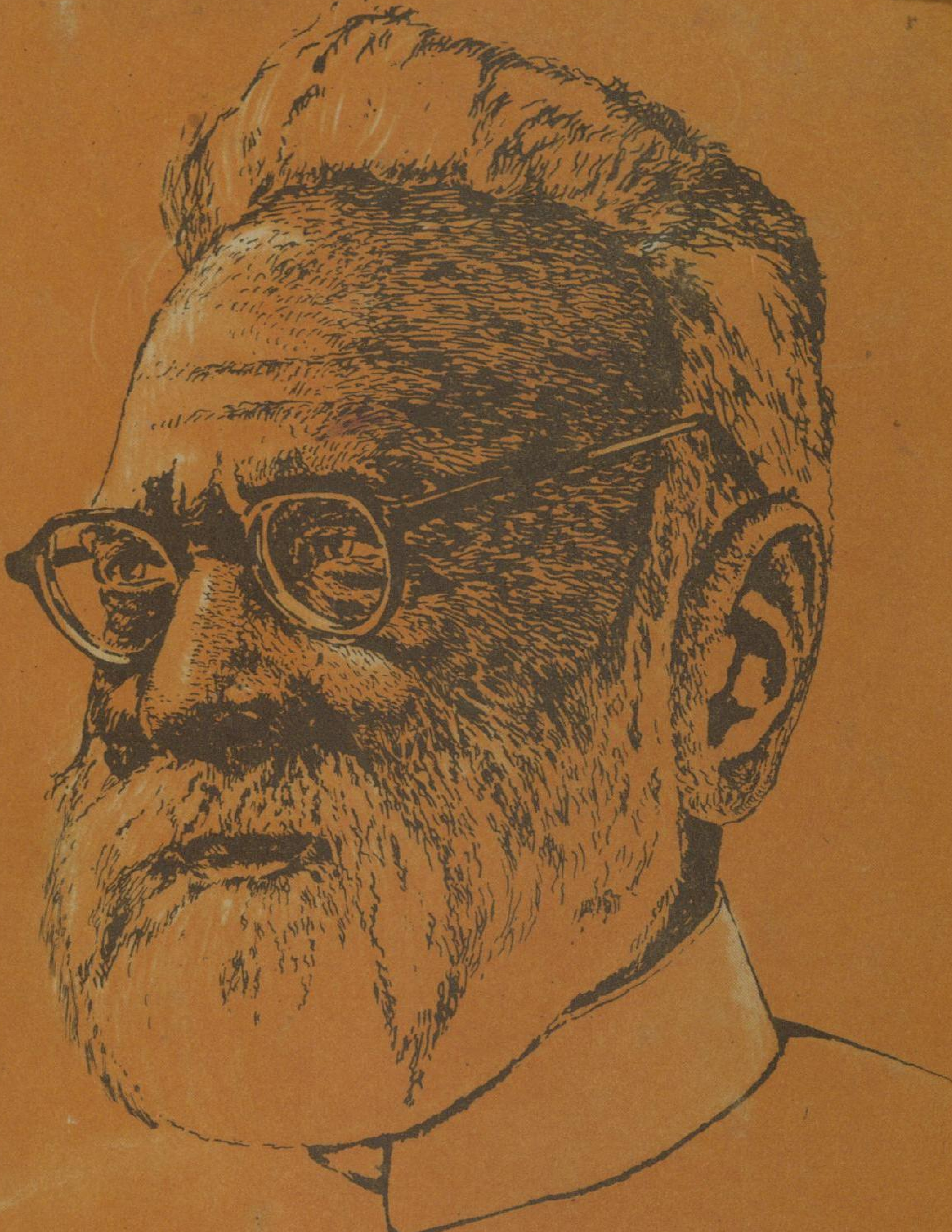


بابائے اردو

احوال و افکار

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

بابائے اُردو ــــ احوال و افکار

بابائے اُردو

احوال و افکار

ڈاکٹر سیّد مُعین الرّحمٰن
پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج لائل پور

سنگِ میل پبلی کیشنز
چوک اُردو بازار ○ لاہور

سالِ اشاعت : ۱۹۷۶ء

ناشر : نیاز احمد

مطبع : ندرت پرنٹرز، لاہور

قیمت : ۱۵ روپے

برادرِ مکرّم **سیّد جعفر حسین** مرحوم و مغفور

کی یاد میں :

"ہر چند کہ فرقت میں تری زہر ہو جینا
کچھ قہر ہے ایسا کہ جیئے بن نہ رہا جائے"

لاہور،
۳۰- مارچ ۱۹۷۵ء

(دستخط)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

ایم۔اے، پی ایچ، ڈی

مشاغل: ریسرچ اسکالر، ترقی اردو بورڈ، کراچی ۱۹۶۳ء — ۱۹۶۴ء

لیکچرار شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، بہاول نگر ۱۹۶۴ء — ۱۹۶۵ء

لیکچرار شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ۱۹۶۵ء — ۱۹۶۶ء

لیکچرار شعبۂ اُردو، ایف سی کالج، لاہور ۱۹۶۷ء — ۱۹۷۳ء

موجودہ مصروفیت: وائس پرنسپل، پروفیسو صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج لائل پور

تصنیفات و تالیفات: ۱۔ سید وقار عظیم — سوانحی خاکہ ۱۹۶۷ء

۲۔ نقدِ عبدالحق ۱۹۶۸ء

۳۔ اشاریۂ غالب[۱] ۱۹۶۹ء

۴۔ مطالعۂ یلدرم[۲] ۱۹۷۱ء

۵۔ غالبیات کا تحقیقی مطالعہ[۳] ۱۹۷۲ء

۶۔ غالب اور انقلاب ستاون[۴] ۱۹۷۴ء

۷۔ آپ بیتی: رشید احمد صدیقی ۱۹۷۴ء

۸۔ ذکرِ عبدالحق ۱۹۷۵ء

۹۔ بابائے اُردو — احوال و افکار طبع اول ۱۹۶۴ء، طبع دوم ۱۹۷۶ء

۱۰۔ خیالستان (ترتیب مع مقدمہ) طبع اول ۱۹۶۸ء، طبع دوم ۱۹۷۶ء

۱۱۔ فرمودات عبدالحق ۱۹۷۶ء

مُستقل پتا: بہاول نگر: رحمٰن اسٹریٹ نمبر ۱ بہاولنگر

لاہور: پوسٹ بکس نمبر ۹۹۷، لاہور ۲

---

۱ ''اشاریۂ غالب'' پر ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا دوسرا انعام مبلغ ۳ ہزار روپے عطا کیا۔

۲ ''مطالعۂ یلدرم'' پر ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا پہلا انعام مبلغ ۵ ہزار روپے عطا کیا۔

۳ اس مقالے (۷۸۸ صفحات) پر ۱۹۷۲ء میں جامعہ سندھ نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند عطا کی۔

۴ ''غالب اور انقلاب ستاون'' پر ۱۹۷۴ء کا داؤد ادبی انعام مبلغ ۵ ہزار روپے عطا کیا گیا۔

ترتیب :

شرف و افتخار :

فِکر و فن :

ظن و تخمین :

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے!

اِشاریۂ کتاب :

حرفے چند:

ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن

مولوی عبدالحق کی تیسری برسی کے موقع پر، اب سے گیارہ برس پہلے راقم الحروف نے بابائے اُردو کے احوال و افکار کا ایک جائزہ مرتب کیا تھا جس میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۱ء تک کے درمیان مولوی عبدالحق کے بارے میں چھپنے والی کم و بیش سب سوانحی تحریریں اور تنقیدی آراء سمٹ آئی ہیں۔ یہ جائزہ جسے "مطالعۂ عبدالحق" در حیاتِ عبدالحق" کہنا چاہیے رسالہ "قومی زبان" کراچی کے بابائے اُردو نمبر، ۱۶۔اگست ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ (صفحہ ۳۲۱ تا ۴۵۵) — ۱۹۶۴ء ہی میں انجمن ترقی اُردو (پاکستان)، کراچی کی طرف سے اس جائزے کی محدود کتابی اشاعت بھی عمل میں آئی — یہ کتاب اب عام طور سے دستیاب نہیں۔

بابائے اُردو کی چودھویں برسی کے موقع پر جناب نیاز احمد کے زیرِ اہتمام، اضافے اور ترمیم کے ساتھ کتاب کی دوسری اشاعت عمل میں آ رہی ہے۔ خُدا نیاز صاحب کو اس حسنِ عمل کا صلہ دے، نیک نام رکھے اور ناموَر کرے۔

۱۹۶۴ء میں یہ کتاب ڈاکٹر شوکت سبزواری کے "تعارف" کے ساتھ شائع ہوئی تھی، علامہ نیاز فتح پوری نے "نگار" میں اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے "صدق" میں اس پر اظہارِ خیال کیا۔

مولانا غلام رسول مہر، پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر محمد باقر، پروفیسر محمد طاہر فاروقی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے راقم الحروف کے نام اپنے مکاتیب میں اس کام پر داد اور مبارک باد دی۔ اب یہ ساری تحریریں آغازِ کتاب میں شامل ہیں۔ مقصود، ان حوصلہ افزا تحریروں کا محفوظ کر لینا بھی ہے جنھوں نے مجھے اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز میں تقویت بخشی اور کام کرتے رہنے کا حوصلہ عطا کیا۔

"بابائے اردو" ایک زندہ استعارہ ہیں، انھیں زوال نہیں، اس لیے یقین ہے کہ کتاب بارِ دیگر قبولِ عام پائے گی۔

لاہور:

۱۶۔ اگست ۱۹۷۵ء

(ڈاکٹر سید معین الرحمن)

عرضِ مرتب (دیباچہ طبع اول):

سید معین الرحمٰن

ہمارے یہاں ایسے "اتفاق" ذرا کم ہوئے ہیں کہ کسی شخص کو جیسا چاہیے اُس کی زندگی میں ہی خراج نصیب ہوا ہو۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی خوش بختی اس اعتبار سے مسلّم ہے کہ "وہ اپنی زندگی میں ہی مداحوں، محققوں اور طالبانِ علم کے لیے ایک شاندار موضوع بن چکے تھے"

متفرق مضامین سے قطع نظر جو مولوی صاحب کے بارے میں مختلف اخبارات و رسائل میں جہاں تہاں شائع ہوئے مولوی صاحب کے جیتے جی بعض رسائل نے اپنی اشاعتیں خصوصیت سے "بابائے اُردو نمبر" کے طور پر وقف کیں۔ ان رسائل کی مختصر کیفیت یہ ہے:

۱۔ "نورس" دو ماہی مجلہ عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن

"مولوی عبدالحق صاحب کی زندگی کے مختلف رُخ"

مطبوعہ: ۱۹۳۰ء صفحات: ۱۸۷

مرتبہ: سید وہاج الدین، غلام ربانی، شرف الحق

۲۔ رسالہ "جوہر" آرگن انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

"اُردو ادب و زبان نمبر"

مطبوعہ: مارچ ۱۹۴۰ء   صفحات متعلق مولوی عبدالحق: ۱۳۲

ادارۂ تحریر: حسن سبحانی صدیقی، عبداللطیف اعظمی، اخلاق الرحمٰن قدوائی

۳۔ ماہنامہ "الشجاع"، ٹائمز پریس، صدر کراچی

"عبدالحق نمبر"

مطبوعہ: اگست ۱۹۵۹ء   صفحات: ۱۵۲

مرتبہ: ایس ایم غیاث الدین، سلمان الارشد

۴۔ سہ ماہی "نورس" مجلہ انجمن ہنی باغ اسکول، کراچی

"عبدالحق نمبر" مدیر: شریف الحسن

مطبوعہ: جولائی ۱۹۶۰ء   صفحات: ۱۹۰

۵۔ سہ ماہی "مجلس" مجلہ اردو مجلس، حیدر آباد دکن

"مولوی عبدالحق نمبر"

شمارہ: اکتوبر ۱۹۶۰ء جنوری ۱۹۶۱ء   صفحات: ۳۴۴

مدیر: محمد منظور احمد۔

مولوی عبدالحق صاحب کے فردوس نشین ہونے پر ملک اور بیرونِ ملک کے مقتدر علمی و ادبی رسائل اور اخبارات نے مرحوم کی یاد میں خاص نمبر شائع کیے۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور رہے گا لیکن محولا بالا پانچ رسائل کو جن کی مجموعی ضخامت نو سو صفحات کے قریب ہوتی ہے، یہ امتیاز حاصل ہے کہ مولوی صاحب نے ان کا مطالعہ فرمایا، یہ مولوی صاحب کی نظر سے گزرے۔ "بابائے اردو کے احوال و افکار" اِن پانچ رسائل کے نثری مشمولات ہی کی تلخیص ہے۔

'بابائے اردو کے احوال و افکار' کی ترتیب کی کہانی میری خواہشِ ناتمام کی کہانی ہے۔ پچھلے سال کی بات ہے میں نے حیاتِ عبدالحق پر کام کرنے کا عزم کیا۔ میری خواہش تھی کہ مولوی صاحب کے سوانح مرتب

کروں میں اس کا اہل نہ تھا لیکن ایسا کب ہوا ہے کہ خواہش کبھی غور و فکر کی بنیاد پر اُبھری ہو! ویسے بھی یہ ایک فرد سے زیادہ ایک ادارے کے کرنے کا کام تھا، اس کے لیے ذاتی وقوف کے علاوہ ضرورت تھی کہ مولوی صاحب کی کُل تصانیف اور اُن کی جملہ تحریریں سامنے ہوں نیز اُن کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ پیشِ نظر ہو۔

مولوی صاحب کی تالیفات و تصنیفات تو وقتِ ضرورت کُتب خانوں سے میسّر آسکتی تھیں اس لیے اولاً میں نے مولوی صاحب کے بارے میں لکھے گئے منتشر مواد کو کارڈ انڈیکس کی صورت میں ضروری تصریحات کے ساتھ جمع کرنا شروع کیا۔ چند ماہ کی محنت اور کوشش سے سامنے کا سارا مواد جمع ہو گیا۔ خیال تھا کہ اب اِس کی مدد سے سوانح کا کام شروع کر دوں۔ اور اِکّا دُکّا مضامین جیسے جیسے علم میں آتے جائیں فراہم کرتا رہوں کہ یک بیک کچھ سانحوں سے دو چار ہونا پڑا۔ مجھے یاد ہے کہ سالِ گزشتہ "حیات الحق" پر کام کرنے کا پروگرام ترتیب دینے کے بعد تلاش اور اہتمام سے اچھا عمدہ کاغذ لے کر گھر آیا تھا تو نانی اماں نے اسے مطلوبہ سائز میں تراشنے میں میری مدد کی تھی۔ مجھے فرحاں دیکھ کر وہ خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں اور مجھے کام میں بے سُدھ دیکھ کر اِدھر اُدھر میری صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا کرتی تھیں۔ یہ کیا خبر تھی جلد ہی وُہ وقت آنے والا ہے کہ اوّل اوّل مجھے خود اُن کی صحت اور سلامتی کی طرف سے مشوّش اور مُضطرب اور آخر آخر اُنہیں رونا پڑے گا۔ اُن کی موت نے مجھے اپنے معمولات سے اُچاٹ دیا۔ چند ہفتوں بعد ہی ناگہاں میرے ایک چھوٹے بھائی اللہ کو پیارے ہوئے تو لکھنے پڑھنے کا حوصلہ پست اور ولولہ سرد پڑ گیا۔ میں کچھ عرصے کے لیے "زندہ جاوید" ہو کر رہ گیا۔ پھر کچھ اِس نوع کی ذمّہ داریاں رہیں کہ مولوی صاحب کی سوانح نویسی پر توجہ نہ کر سکا۔ میری انتہائی آرزو یہ ہے کہ ذرا فراغت اور آسودگی میسر آئے تو اِس کام کو انجام دوں۔ جانے کب یہ گھڑی نصیب ہو اور کون جانے نصیب بھی ہو! اِس طرح بابائے اردو کے احوال و افکار کی ترتیب کی کہانی میری خواہش ناتمام کی کہانی ہے۔

سوانح کے لیے کارڈ انڈیکس کی صورت میں محفوظ، اُن مضامین پر مشتمل تحریروں سے، جو مولوی

صاحب کے جیتے جی لکھی گئیں، احوال و افکار کو ترتیب دے کر اس کے چھ حصے کیے گئے ہیں پہلا حصہ مولوی صاحب کی زندگی اور مقصدِ زندگی کی کہانی ہے۔ دوسرے حصے میں تاثراتی خاکوں شخصی مرقعوں اور ایسے مضامین کو رکھا گیا ہے جو مولوی صاحب کی سیرت و کردار کے کسی رُخ یا طبیعت کے کسی رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چوتھے حصے میں وہ مضامین شامل ہیں جو مولوی صاحب کے فکر و فن کے کسی ایک گوشے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ پانچویں حصے میں مولوی صاحب کی ذات وصفات اور خدمات کا مجموعی جائزہ لیا اور تخمینہ لگایا گیا ہے۔ اِس حصے میں ایسے مضامین بھی ہیں جو مولوی صاحب سے مُتاثر ہو کر تمام تر محبت کے اعتراف اور شخصیت کے خراج کے طور پر لکھے گئے۔ چھٹے حصے میں مولوی صاحب کے بارے میں مشاہیر اور اکابر کی مختصر آرا ترتیب دی گئی ہیں۔ ان کی حیثیت مستقل مضامین کی نہیں، انہیں بیانات اور مکتوبات وغیرہ سے اخذ و انتخاب کیا گیا ہے۔

'بابائے اُردو کے احوال و افکار کا یہ جائزہ مولوی صاحب کی زندگی میں مطبوعہ رسائل کے مواد سے مرتب اور ملخّص کیا گیا ہے۔ ہر مضمون کے آخر میں اُس کا حوالہ درج کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۱ء کے دوران مولوی صاحب سے متعلق چھپنے والے پانچ خاص نمبر جو اَب عام طور سے دستیاب نہیں ہوتے، ضروری تفصیلات کے ساتھ اس جائزے میں سمٹ آئے ہیں۔ ترتیب میں موضوعات کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے نوآموز اور نامور اہلِ قلم کا فرقِ مراتب قائم نہیں رکھا گیا کہ اس سے زیادہ اہم میرے نزدیک مولوی صاحب کے احوال و افکار کو صحیح سیاق و سباق میں پیش کرنا تھا۔

آخر نہ کہ اخیر، ضمیمے کے طور پر مولوی عبدالحق کی "آپ بیتی" کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اس کے تحت آپ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کہانی خود ان کی زبانی مطالعہ فرمائیں گے۔ مولوی صاحب نے کہیں اہتمام اور صراحت کے ساتھ اپنے حالات نہیں لکھے۔ ضمناً جہاں تہاں جو باتیں متعلق ذات آگئی ہیں، انھیں یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح مولوی صاحب کی یہ کہانی خود مولوی صاحب ہی کی زبان و بیان میں ہے یہ کہانی بھی مولوی صاحب کے "سوانح" پر میرے کام کے

سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اسے محترم محمد طفیل صاحب مدیر "نقوش" کی فرمائش پر مُرتب کیا گیا تھا۔ "نقوش" کے "آپ بیتی نمبر" میں یہ شریک بھی ہے۔ طفیل صاحب نے اس کی ترتیب کے لیے بہت کم مہلت دی تھی پھر خود مجھے "نقوش" کے دامن کا خیال بھی تھا اس صورت میں مجھے کارے کردم کا دعوےٰ نہیں۔ میں اپنے اِس کام سے مطمئن نہیں ہوں۔ اس میں اضافے کی بہت گنجائش ہے۔ پھر بھی یہ گمان شاید بے جا نہیں کہ اس اَدنیٰ سی کوشش نے مولوی صاحب پر کام کرنے کی ایک نئی اور انوکھی طرح ضرور ڈال دی ہے ـــــ اِس "آپ بیتی" کی ترتیب و تسوید میں ان کتابوں سے اِستفادہ کیا گیا ہے:-

۱۔ چند ہم عصر (نسخہ، اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۹ء)

۲۔ خطباتِ عبدالحق (مرتبہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ۱۹۵۳ء)

۳۔ مکتوباتِ عبدالحق (مرتبہ: جناب جلیل قدوائی، ۱۹۶۳ء)

۴۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو (مرتبہ: مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی، ۱۹۵۳ء)

اِن مستقل کتابوں کے علاوہ رسالہ "نورس" (کراچی) عبدالحق نمبر، رسالہ "ادیب" (دہلی) شبلی نمبر اور "قومی زبان" (کراچی) کے متفرق پرچوں، انجمن کی بعض رپورٹوں اور کچھ کتابچوں وغیرہ سے مولوی صاحب کی تحریر و عبارت انتخاب و اقتباس کی گئی ہے۔

فنونِ لطیفہ میں دخل اور درک کے لیے بڑے ریاض، بڑی سیانی طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اَدب یعنی لفظوں کا فن بھی بڑی جانکاہی اور کار آگاہی چاہتا ہے اور شاید سب سے زیادہ مشکل تب پڑتی ہے جب اپنی ذات، کرتوت اور صفات کے بارے میں لکھنا ہو۔ مُصنف کے ہاتھ خود اپنے چاکِ گریباں پر ہوں تو نظر اس پر نہیں رہنی چاہیئے کہ وہ کیا بتا رہا ہے، دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ کیا کچھ چُھپا رہا ہے ـ اِس کے لیے بڑی تربیت یافتہ نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہر نوع "سخن ہائے ناگفتنی" تک رسائی کا ایک وسیلہ مصنف کا پیرایۂ اظہار و اعتراف بھی

ہوتا ہے یعنی اہمیت اتنی اِس کی نہیں ہوتی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے جتنی اس کی کہ وہ بات کو کس طرح کہتا ہے۔ یہ وُہ میزان ہے جس پر ادیب کے ظرف اور ضبط کی پہچان ہو جاتی ہے۔ سب پردے ہٹ جاتے، اور نقاب اُٹھ جاتے ہیں۔

مولوی عبدالحق اِس قول پر پورا اترتے ہیں۔ اُنھیں مختلف مواقع پر اپنے بارے میں کہنا اور لکھنا پڑا لیکن کہیں وہ نفس کے بہکائے میں نہیں آئے۔ اُنھیں اپنا ذکر مرغوب ہے اور نہ وہ اس ذکر سے مغلوب! وہ بہت سیدھے، سچے اور بے جھجک انسان تھے۔ اُن کی یہ کہانی بھی انھیں عنا صر سے عبارت ہے۔ اُردو اور مولوی صاحب میں دوئی جاتی رہی تھی۔ اُنھیں اُردو سے محبت تھی اور جنون کی حد تک، یہ کہانی مولوی صاحب ہی کی نہیں اُردو کی کہانی بھی ہے۔

مولوی صاحب نے کہیں اپنے حالات یکجا نہیں لکھے لیکن اس کہانی کو اِن معنی میں مختصر "سندی آپ بیتی" (Authoritative Autobiography) کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمام کی تمام مولوی عبدالحق ہی کے قلم کا نتیجہ ہے۔ میں صرف اِس کی ترتیب و تہذیب کا قصوروار ہوں۔ ذیلی حاشیوں میں اصل مآخذ کا حوالہ ہر جگہ درج کر دیا گیا ہے۔ یہ اہتمام اِس لیے نہیں کیا گیا کہ ایک علمی مضمون کی شان یہ بھی ہے، بلکہ جس نوع کی یہ کوشش اور کاوش ہے اُس کا عین اقتضا یہی تھا۔

مخدومی ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے کلماتِ مرحمت و شفقت ہی سے مجھے مفتخر نہیں کیا، ترتیب پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت بھی فرمائی۔ اِسے میں اپنے لیے بڑی عزت خیال کرتا ہوں۔ مولوی صاحب پر کام کرنے والوں کو مدد ملنا تو دور کی بات ہے، کسی ایک شخص کے دل میں بھی اس جائزے اور کوشش نے مولوی صاحب کی ذات اور مقصدِ حیات سے لگاؤ اور لگن پیدا کی تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

سید معین الرحمٰن

ڈاکٹر شوکت سبزواری

تعارف

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی شخصیت محتاجِ تعارف ہے اور نہ محتاجِ تعریف ہی — برصغیر پاک و ہند کا بچّہ بچّہ جس کے نام اور کام سے واقف ہو اُسے تعارف کی کیا احتیاج! رہی "تعریف" سو مولوی صاحب کی تعریف کرنا ایسا ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ نیازمندوں میں سے مولوی صاحب کے بارے میں اگر کبھی کسی نے کچھ لکھا تو اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ مولوی صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب و زبان کی خدمت انجام دی جائے اور اس طرح اُس کام کو آگے بڑھایا جائے جس کے لیے مولوی صاحب نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی — مولوی صاحب اُردو کے تھے اور اُردو، مولوی صاحب کی۔ مولوی صاحب کا ذکر، اُردو کا ذکر ہے۔ مولوی صاحب کے تصورات وافکار اور علمی و ادبی کارناموں کا چرچا کرنے سے اُردو کا چرچا ہوتا ہے۔

عزیز رفیق سید معین الرحمٰن صاحب مولوی صاحب کے انہی نیازمندوں میں سے ہیں — اور یہ ان کی سعادت سمجھی جائے گی کہ انھوں نے مولوی صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا کبھی کوئی موقع نظرانداز نہیں کیا:

اَعِد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ

ھوالمسك ما کرّرته یتضوع

(نعمان کا ذکر ہمارے سامنے بار بار کرو، اس لیے کہ وہ مشک کی طرح ہے اور مشک کو جتنی بار سونگھو، وہ مہکتا ہے اور خوشبو دیتا ہے۔)

اِس مرتبہ مولوی صاحب کی تیسری برسی کے موقع پر انھوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ اُن تمام مقالات و تاثرات کو جو مولوی صاحب کے بارے میں خود اُن کی زندگی میں برِّصغیر کے موقر رسالوں میں شائع ہوئے یک جا کر دیں اور ترتیب دے کر ایک لڑی میں پرو دیں۔ کتاب کے چھ حصّوں میں چھوٹے بڑے تمام مقالے ایک خاص ترتیب سے سمو دیئے گئے ہیں — مولوی صاحب کی تحریروں سے انتخاب کر کے مولوی صاحب کی خودنوشت آپ بیتی کی ترتیب، ایک اُپج ہے۔ اسے، اِس مجموعے میں شامل کرنے سے، اس کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

"عرضِ مُرتّب" کے عنوان سے ابتدا میں ان رسائل و جرائد کا تفصیلی ذکر بھی کر دیا گیا ہے جن سے یہ تمام مواد اخذ کیا گیا ہے تاکہ مولوی صاحب پر تحقیقی کام کرنے والوں کی اصل مآخذ تک رسائی ہو سکے جب چاہیں، وہ اس کی طرف رجوع ہو جائیں — اِس بزم میں شرکت کرنے والے عام طور سے مولوی صاحب سے قریب تھے۔ انھوں نے مولوی صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا، دیکھ کر اور جانچ پرکھ کر ذاتی علم کی بنیاد پر لکھا ہے۔ اس کی حیثیت سُنے سُنائے واقعات کی سی نہیں، اِس لیے میرا خیال ہے کہ مولوی صاحب کی حیات اور علمی کارناموں پر آئندہ تحقیقی کام کرنے والے، اس دستاویزی مواد سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

ہر چند، اِس مجموعے سے مولوی صاحب کی زندگی اور علمی کارناموں کے بہت سے گوشے

روشنی میں آگئے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب کی رنگا رنگ شخصیت اور گوناگوں علمی کارناموں کے کچھ ایسے گوشے بھی ہیں جنہیں اور زیادہ اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ بشرطِ صحت و فرصت اِنشاءاللہ میں اس سلسلے میں کچھ لکھوں گا، فی الحال یہ تعارفی سطریں لکھ کر "اُنگلی کاٹ کر شہیدوں میں داخل ہو رہا ہوں"

——— شوکت سبزواری

○

نیاز فتحپوری

"بابائے اُردو — احوال و افکار"

مُرتب: سیّد مُعین الرحمٰن ناشر: انجمن ترقی اُردو، کراچی

سیّد مُعین الرحمن صاحب، گورنمنٹ ڈگری کالج، بہاول نگر میں اُردو کے اُستاد ہیں۔ اس سے پہلے وہ ترقی اُردو بورڈ کراچی سے منسلک تھے اور کالج کے زمانۂ طالب علمی میں اُنہیں انجمن ترقی اُردو اور اس کے روحِ رواں بابائے اُردو کی صحبتوں سے فیض اُٹھانے کا موقع بھی ملا۔ گویا وہ شروع ہی سے علمی ادبی شخصیتوں اور اداروں سے قریب تر رہے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ اُردو اور مشاہیرِ اُردو سے اُنہیں خاص لگاؤ پیدا ہو گیا، ایسا لگاؤ جو اسلاف کے کارناموں کو محض بوسہ دے کر یا ان پر عقیدت مندی کے آنسو بہا کر مطمئن نہیں ہوتا بلکہ ان کے نصبُ العین کو عام کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے چنانچہ زیرِ نظر تالیف سیّد مُعین الرحمٰن صاحب کے اسی حوصلے کی مظہر ہے۔

بابائے اُردو پر اُن کی وفات کے بعد بہت کچھ لکھا گیا ہے اور برابر لکھا جا رہا ہے۔ لیکن اس کام کی نوعیت و اہمیت، دوسرے کاموں سے بہت مختلف ہے۔ اِس میں مؤلف نے بابائے اُردو کی حیات و مقصدِ حیات، سیرت و شخصیت اور فکر و فن سے متعلق اُردو کے سارے مُمتاز اہلِ قلم کی رائیں یکجا کر دی ہیں، من و عن نہیں، اخذ و اقتباس کے ساتھ، اِس طرح کہ مُفید مطلب باتیں یکجا ہو جائیں اور قارئین کو کم سے کم وقت میں مولوی صاحب پر اتنا مواد ہاتھ آجائے جو اُنھیں جاننے

اور سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ آخر میں "آپ بیتی" کے عنوان سے مولوی صاحب کی کہانی خود اُن کی زبانی مُرتّب کی گئی ہے۔ اِس کام میں مؤلف نے مولوی صاحب کی ساری تحریروں کو نظر میں رکھا ہے اور اقتباسات میں ایسا منطقی ربط پیدا کر دیا ہے کہ وُہ سچ مُچ مولوی صاحب کی خود نوشت بن گئی ہے پھر چونکہ مؤلف نے، ماخذ کے حوالے بھی ہر جگہ نہایت احتیاط سے درج کر دیئے ہیں، اس لیے اس کی حیثیت مولوی صاحب سے مُتعلق ایک مستند دستاویز کی سی ہو گئی ہے اور اِسی لیے اُمید ہے کہ مولوی صاحب پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے یہ تالیف رہنمائے خاص کی حیثیت رکھے گی۔"

(— نگار پاکستان، کراچی، اپریل ۱۹۶۵ء ص ۷۷-۷۸)

○

مولانا عبدالماجد دریابادی

"بابائے اُردو" از: سیّد مُعین الرحمٰن صاحب

۱۳۵ صفحات، قیمت درج نہیں۔

پتہ: انجمن ترقی اردو، اُردو روڈ، کراچی (پاکستان)

"بابائے اُردو مرحوم کے کام، اور شخصیت اور خدمات سے متعلق ملک بھر کے مشاہیر کے تاثرات — مسلمانوں کی فہرست تو خیر لمبی ہی ہے، لیکن غیر مسلم بھی متعدد شامل ہیں، آخر میں ۲۵، ۳۰ صفحات کے ایک مضمون میں مُعین صاحب نے بڑی تلاش، اور دیدہ ریزی کر کے مرحوم کی آپ بیتی، مرحوم ہی کے نوشتوں سے چُن کر جمع کر دی ہے — کتاب قابلِ قدر ہے اور مرحوم کے ہر قدر شناس کے ہاتھ میں جانے کے لائق — مُعین صاحب، مدتوں بابائے اُردو کے رفیقِ کار رہے ہیں اور اب گورنمنٹ کالج بہاول نگر (پاکستان) میں شعبۂ اُردو کے اُستاد ہیں —"

(صدقِ جدید، لکھنو، ۲۱-مئی ۱۹۶۵ء)

○

مولانا غلام رسول مہر:

باسمہ سُبحانہٗ

مُسلم ٹاؤن، لاہور۔

۱۶۔ مارچ ۱۹۶۵ء

صدیقِ مکرم، سید مُعین الرحمٰن صاحب، "بابائے اُردو" (احوال و افکار) کے مُطالعے سے بے حد خوش وقت ہوا:

اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

اِس تحفۂ بہیہ کے لیے دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ اِن تمام اِقتباسات کو نہایت وسیع ذخیرے میں سے چُن چُن کر نکالنا، بالکل ایسا ہی تھا، گویا کسی بے پایاں ریگ زار میں موتی بکھیر دیئے گئے ہیں۔ آپ نے انتہائی محنت و عرق ریزی سے وہ موتی اکٹھے کیے، پھر انھیں اِس حُسنِ ترتیب سے منسلک کر دیا کہ ہر موتی کو اس کی موزوں جگہ مل گئی۔

یہ کام مستقل تصنیف سے بدرجہا زیادہ مشقّت طلب اور صبر آزما تھا۔ آپ نے اسے نہایت خوش اسلوبی اور جامعیت سے انجام دیا۔ اِس کی تحسین کے لیے الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں آپ کا حامی و ناصر ہو اور بدرجہا بہتر و مُفید تر کام انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

نیاز مند

مہر

○

پروفیسر حمید احمد خاں:

VICE- CHANCELLOR

SENATE HALL, LAHORE

۲۰۔ اگست ۱۹۶۵ء

عزیزِ مکرّم سیّد معین الرحمٰن صاحب ــــ بابائے اُردو کے متعلق آپ کی دِل چسپ اور مُفید تالیف کو مَیں نے جستہ جستہ دیکھا ہے۔ میرے خیال میں نہ صرف، ہر وہ شخص جسے مولوی صاحب مرحوم سے ذاتی نیاز حاصل تھا، بلکہ اُردو زبان و ادب کا ہر نام لیوا اس کتاب کو حرزِ جان بنائے گا۔ والسّلام

خیر طلب

ــــ حمید احمد خاں

○

پروفیسر ڈاکٹر غلام مُصطفٰے خاں:

سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد

۱۰۔ مارچ ۱۹۶۵ء

جناب محترم و مکرّم مُعین صاحب دام مجدکم، السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

مقالہ "بابائے اُردو" (احوال و افکار) ملا۔ بہت ممنون ہوں کہ آپ نے کرم فرمایا ــــ لیکن مزید کرم یہ ہے کہ آپ نے اُردو ادب کا ایک بیش قیمت کارنامہ انجام دیا۔ بالخصوص "آپ بیتی" خوب ہے، نہایت اہم اور نہایت مُفید۔ اللہ پاک آپ کو مزید علمی اور ثقافتی کاموں کا موقع عطا فرمائے اور بیش از بیش خیر و فلاح سے نوازے۔ آمین! پھر شکر گزار ہوں۔ فقط، والسّلام، احقر

ــــ غلام مُصطفٰے خاں

○

پروفیسر محمد طاہر فاروقی:

شعبۂ اُردو، پشاور یونیورسٹی

۱۸۔ ستمبر ۶۴ء

مُحبِ مکرم معین صاحب، السلام علیکم

آپ کا ۱۴ ستمبر کا خط ملا۔ "بابائے اُردو — احوال و افکار" کی جلد بھی وصول ہوئی۔ بے حد دلچسپ ترتیب و تالیف ہے۔ بابائے اردو پر بہت کچھ آچکا ہے، لیکن یہ آپ کو واقعی خوب سوجھی کہ اُن تحریروں کو مُرتّب اور مُلخّص کر دیا جائے جو ممدوح کی نظر سے گزریں۔ ان کی بلاشبہ ایک خاص اہمیت ہے۔ مولوی صاحب قبلہ کے بارے میں معاصر رایوں کا یہ "اشاریہ" تحقیق کنندگان کی رہنمائی کا کام دے گا۔

خاکسار

محمد طاہر فاروقی

○

ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

شعبۂ اُردو، کراچی یونیورسٹی

۱۵۔ مارچ ۱۹۶۵ء

برادرم مُعین صاحب، سلام مسنون

آپ کی کتاب "بابائے اردو" موصول ہوئی، ایک نیاز صاحب کے نام، ایک میرے نام۔ نیاز صاحب، شاید آج کل ہی میں "نگار" کے لیے اس پر کچھ لکھیں — آپ کے علمی و ادبی انہاک سے بڑا جی خوش ہوتا ہے، خصوصاً "بابائے اردو" پر آپ کا یہ کام مجھے بہت پسند آیا۔ آپ اِس کتاب کے ذریعے مولوی صاحب کی روح کو سامنے لے آئے ہیں اور اس لیے یقین ہے کہ یہ مولوی

صاحب کے دوست دشمن دونوں میں بہ نظرِ استحسان دیکھا جائے گا اور آئندہ کام کرنے والوں کو اس سے روشنی نصیب ہوگی۔

آپ کا

فرمان فتح پوری

○

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر:

یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

۱۵- اکتوبر ۱۹۶۵ء

محترمی معین صاحب، سلام مسنون

آپ نے "نقوش"، (مئی ۱۹۶۵ء) اور "بابائے اُردو" (احوال و افکار) کے جو دو رسالے عنایت فرمائے، اُن میں سے، مَیں نے مرحوم بابائے اُردو کے متعلق، آپ کے لکھے ہوئے اور ترتیب دیئے ہوئے مضامین پڑھے۔ ان میں سے بیشتر مَیں پہلے بھی پڑھ چکا تھا، اور آپ کی کاوش اور سلیقے کی داد دے چکا تھا۔ اب، لکھ کر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کی عنایت کا بے حد شکر گزار ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اِس قسم کے کام کرنے کی مزید توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

محمد باقر

○

حیات و مقصدِ حیات

پروفیسر سیّد محمّد:
شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ

بیسویں صدی کا سرسیّد

یہ مضمون اُردو مجلس حیدرآباد (دکن) کی طرف سے منائے گئے یومِ مولوی عبدالحق پر ۲۹ مئی ۱۹۶۰ء کو پڑھا گیا۔ مضمون نگار نے سلسلہ وار مولوی صاحب کے حالاتِ زندگی اور خدمات کا ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق بیسویں صدی میں اُردو کے سب سے بڑے محسن اور سب سے بڑے مجاہد ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں انگریزی زبان و ادب کے علاوہ فلسفہ اور ریاضی، مولوی صاحب کے خاص مضامین تھے۔ ریاضی میں وہ اپنے ہم جماعت سر ضیاءالدین مرحوم کے حریف تھے۔ خوش قسمتی سے انہیں سرسید اور ان کے رفقائے کار علی الخصوص حالی، ڈپٹی نذیر، محسن الملک، وقار الملک، عمادالملک اور جسٹس سید محمود ایسے اکابرِ قوم کا فیضِ صحبت و فیضِ تربیت حاصل رہا۔ علی گڑھ سے نکلتے ہی بمبئی میں نواب محسن الملک کے یہاں انگریزی مراسلت اور مضمون نگاری کے کام پر مامور ہوئے۔ دو سال کے اندر افسر الملک انہیں حیدرآباد لے آئے اور مدرسۂ آصفیہ کی پرنسپلی پر ان کا تقرر کیا۔ چند سال بعد وہ ہوم سیکرٹری کے محکمے میں مترجم کی خدمت پر مامور ہوئے۔ پھر سراج الحسن سراج یار جنگ کے عہدِ نظامت میں سررشتۂ تعلیمات کے مددگار اور بعد کو صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات بنا دیے گئے۔ اس خدمت پر عرصہ دراز تک فائز رہنے کے بعد جامعہ عثمانیہ کے تحت قائم کئے گئے کالج کی پرنسپلی پر بدل دیئے گئے۔ مولوی صاحب کی زندگی کا بہترین حصہ اورنگ آباد میں بسر ہوا جس کے چپّے چپّے سے مولوی صاحب کو محبت ہے۔ ۱۹۲۹ء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد اور سر اکبر حیدری کے بے حد اصرار پر مولوی صاحب نے پروفیسر اُردو کی خدمت قبول کی اور حیدرآباد چلے آئے۔ وہ صرف

چند اونچی جماعتوں کو پڑھاتے اور اپنا باقی وقت تصنیف و تالیف اور تحقیقاتِ علمی میں صرف کرتے تھے۔

وہ اُن دنوں شہر سے بہت دُور، بنجارہ ہل پر سکونت پذیر تھے جہاں اس وقت صرف دو چار بنگلے تھے۔ اور اطراف میں صرف مناظرِ قدرت ہی تھے۔ اس پُرسکون فضا میں آٹھ دس برس خاموش علمی کام کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں اُردو زبان کی بقا اور حفاظت کے لیے انہیں سینہ تان کر میدان میں اُترنا پڑا۔ سرکاری خدمت سے استعفےٰ دیا، انجمن کا دفتر لے کر دہلی پہنچے اور وہاں نو برس تک علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ اُردو کے حقوق کی حفاظت اور حمایت کے لیے بالکل مجاہدانہ انداز میں مصروف رہے۔

۱۹۴۸ء میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ تن تنہا انہیں کراچی کی راہ لینا پڑی۔ پاکستان میں انجمن قائم کی اور ایک نئے محاذ پر، پھر اُسی استقلال اور جواں ہمتی کے ساتھ اُردو کی خدمت و حفاظت کی جدوجہد شروع کر دی۔ اُردو کالج قائم کیا اور اُردو کو قومی زبان بنانے کی مہم چالو کی گئی۔ اُردو یونیورسٹی بنانے کی دیوانہ وار دھن میں لگ گئے۔ مولوی صاحب کی یہ علمی جدوجہد وقت کے تقاضے کا نتیجہ ہے۔ اُن کا اصلی میدان علمی، ادبی و تحقیقی ہے۔ سرسید کے فیضِ تربیت سے اور اُن کی زندگی کو مشعلِ راہ بناکر انھوں نے اپنے دل میں علم کی ایسی لگن پیدا کر لی تھی کہ ساری زندگی اسی شوق میں گزاری وہ اس کام میں سچی روحانی مسرت محسوس کرتے ہیں۔

مولوی صاحب نے اپنے تمام علمی کام بڑی محنت اور عرق ریزی سے پایۂ تکمیل کو پہنچائے قدیم اُردو نثر اور نظم کی تلاش، مطالعہ، تصحیح و ترتیب اور فرہنگ نویسی — انگریزی اُردو لُغت — اصطلاحاتِ علمیہ کی وضعگی — رسالہ "اُردو" — اُردو لغت، مولوی صاحب کی نمایاں خدمات ہیں۔ مولوی صاحب بیسویں صدی کے سرسیدؔ ہیں وہ نہ صرف سرسید کے فیض یافتہ ہیں بلکہ اُنہیں کا سا ایثار، خلوص، جوشِ عمل اور عملی سرگرمی رکھتے ہیں۔

(مجلس، دکن، صفحہ ۲۶-۳۲)

شیخ چاند مرحوم :
بی۔اے ایل ایل بی

مولوی عبدالحق صاحب کا مقصدِ زندگی

یہ مضمون مولوی صاحب کے ایک شاگرد رشید شیخ چاند مرحوم کا ہے جو نوجوانی ہی میں اٹھ گئے۔ مرحوم کو مولوی صاحب سے غایت درجہ محبت اور عقیدت تھی خود مولوی صاحب نے مرحوم کی تربیت بڑی شفقت اور توجہ سے فرمائی تھی۔ شیخ چاند نے سوداؔ پر یادگار کام کیا۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب سے شخصی خاکے لکھوائے اور انہیں "چند ہم عصر" کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کیا۔ آج "چند ہم عصر" کو اُردُو کے سوانحی ادب کی آبرو کہا جاتا ہے۔

مضمون نگار نے مولوی صاحب کے مقصدِ حیات کی طرف اشارے کئے ہیں۔ لیکن اپنے مشاہدات سے قطع نظر کیا ہے کہ مبادا اسے حسنِ عقیدت پر محمول کیا جائے۔

مولوی صاحب ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے مکتب میں پائی۔ اعلیٰ تعلیم علی گڑھ کالج میں حاصل کی۔ ۱۸۹۴ء میں بی۔اے کیا۔ مضامین فلسفہ و تاریخ تھے۔ علی گڑھ کالج کے قیام کے دوران مولوی صاحب کا زیادہ وقت سرسید احمد خان کے ساتھ گزرتا تھا۔ تعطیل میں عموماً سید صاحب آپ کو گھر جانے سے روک دیتے تھے اور مختلف علمی کاموں میں مشغول رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ پر سرسید کی آزاد خیالی اور روشن دماغی کا خاص اثر پڑا۔ مولوی صاحب اردو کی ترقی کا حقیقی اور اعلیٰ خیال مدت سے دل میں رکھتے تھے۔ بی۔اے کے دورانِ تعلیم آپ نے "تہذیب الاخلاق" کے لیے ایک مضمون لکھا جس میں اس مشہور انقلاب انگیز رسالے کو بڑی آزادی سے یہ بتایا کہ اس کے فرائض کیا ہیں۔ ان میں ایک ضروری اور ناگزیر

فرض" اُردو زبان کو ترقی دینا" بھی تھا۔ اس زمانے میں آپ کے مضامین علی گڑھ میگزین اور رسالہ حسن میں چھپے جن کا مدّعا محض اُردو زبان کی خدمت تھا۔ مولوی صاحب طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ سے اورنگ آباد پن چکی کے کتب خانے کی تلاش میں آئے تھے۔ اس زمانہ میں اورنگ آباد تک ریل جاری نہ ہوئی تھی؛ اس لیے آپ کو احمد نگر کے راستے سے آنا پڑا لیکن آپ کے آنے سے بہت قبل وہ مشہور کتب خانہ لٹ چکا تھا۔ دکنی زبان کی چند کتابوں کے سوا آپ کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ اس ناکامی سے آپ کی طلب میں کاہش نہ آئی بلکہ دُھن اور بڑھ گئی۔

مولوی صاحب نے ۱۹۰۱ء میں اردو خطوط نویسی پر دو رسالے لکھے۔ آپ نے اس سے اپنے مقصد کی اشاعت کا خوب خوب کام لیا دوسرے رسالے میں ایک خط باپ کی طرف سے بیٹے کے نام ہے جس میں اسے مادری زبان اُردو کی طرف توجہ دینے کی بھرپور تعلیم اور تلقین کی گئی ہے۔ اس پیغام سے بیٹے کی آنکھوں کے سامنے ایک نیا عالم کھل جاتا ہے اور جوابِ خط میں وہ نہایت خوش اور خلوص سے اس پیغام پر لبیک کہتا اور اسے قبول کرتا ہے۔ یہ رسالے ولی عہدِ وقت نواب میر عثمان علی کو تعلیم دینے کے لیے نواب عماد الملک نے لکھائے تھے جو اس زمانے میں ناظم تعلیمات اور ولی عہد سلطنت کے اتالیق تھے۔ نواب صاحب کی فرمائش سے فائدہ اٹھا کر ایک ادائے خاص سے مولوی صاحب نے ہونے والے تاجدار کے دل میں ابتدا ہی سے اُردو کا بیج بونے کی کوشش کی اور پھر اسی تاجدارِ دکن نے آگے چل کر اردو زبان و ادب کی اشاعت و خدمت میں جو کردار انجام دیا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

یہی وہ ہلکی سی جنبش تھی جس نے حیدر آباد کی فضا میں مادری زبان میں تعلیم کا تلاطم پیدا کیا۔ یہی وہ بنیادی اینٹ تھی جس پر ایک مستحکم، ذی وقعت اور بے عدیل تعمیر چنی گئی۔ حیدر آباد دکن کے تعلیمی انقلاب کے اسباب پیدا کرنے میں مولوی صاحب کی خاموش جانفشانیاں بڑا اہم درجہ رکھتی ہیں۔ مولوی صاحب مہد سے لحد تک طالب علم ہی ہیں۔ انھوں نے خاموش رہ کر اپنے قلم کی جنبش سے اُردو زبان کو مستقل فائدہ پہنچایا۔ "قواعدِ اُردو" کے سوا آپ کی بظاہر کوئی تصنیف

نظر نہیں آتی لیکن اپنی جنبش قلم سے انھوں نے جو کچھ پیش کیا، وہ کئی ہزار صفحوں میں سما سکتا ہے اور اُردو ادب میں کیا بلحاظ موضوع اور کیا بلحاظ اسلوب بیان پائدار زندگی رکھتا ہے۔

اُردو زبان کی راہ میں انھوں نے اپنا مال وزر، وقت، اثر، تدبیر، سیاست، شفقت، محبت جوانی کی رنگینی اور بڑھاپے کا سکون ہر چیز لٹا دی۔ حق یہ ہے کہ ایسے لوگ ہی دنیا کے محسن اور واجب التعظیم ہیں۔

(نورس، اورنگ آباد، صفحہ ۱۳۶ — ۱۵۰؛ جوہر، صفحہ ۴۱ — ۵۴)

مولانا سید عطا حسین:

حیدر آباد دکن

مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو

مضمون نگار کے نزدیک مولوی صاحب کے ذاتی اخلاق اور اُردو ادب اور اُردو زبان کے متعلق ان کی علمی اور قومی خدمات نہایت سبق آموز ہیں اس لیے اس مضمون میں مولوی صاحب کے اخلاق اور قومی و علمی خدمتوں اور کارناموں کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے تاکہ قوم کے لائق اور ہونہار نوجوان مولوی صاحب کے اخلاق و عمل سے سبق لیں اور دیکھیں کہ صداقت اور سوزِ دل سے کام کرنے والوں کو حق سبحانہٗ تعالیٰ کس طرح کامیابیاں مرحمت فرماتا ہے۔

مولوی عبدالحق علی گڑھ سے ڈگری لے کر اواخر ۱۸۹۵ء میں حیدر آباد آئے ایک اسکول میں چند سال تک ملازمت کی نواب سر بلند جنگ حمید اللہ خاں مرحوم سررشتہ عدالت اور تعلیمات کی معتمدی پر مامور ہوئے تو انھوں نے مولوی صاحب کو اپنے دفتر کے صیغۂ تعلیمات میں منتقل کر لیا

مولوی عزیز مرزا کی معتمدی کے زمانے تک مولوی صاحب اس خدمت کو انجام دیتے رہے اس کے بعد صوبہ اورنگ آباد کے تعلیمات کی صدر مہتمی کی خدمت پر اورنگ آباد بھیج دیئے گئے پھر اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہوئے اور یہاں سے پنشن لی ۔۔ اس کے بعد جامعہ عثمانیہ میں اُردو کی پروفیسری پر زبردستی مامور کر لیے گئے۔ تنخواہ ماہانہ ایک ہزار روپیہ تھی کام غالباً دو گھنٹے روزانہ سے زیادہ نہ تھا اور گورنمنٹ سے معاہدہ یہ تھا کہ وہ جب تک چاہیں ملازمت میں رہیں اور جب تک خود علیحدگی نہ چاہیں اس خدمت سے سبکدوش نہیں کیے جائیں گے لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ وہ "ترقی اُردو" کا کام اُس وقت تک خاطر خواہ نہیں کر سکتے جب تک ملازمت کے بار سے سبکدوش ہو کر دہلی جا کر قیام نہ کریں تو انھوں نے بے تامل اس خدمت سے استعفےٰ دے دیا یہ اُن کے ایثار کی ادنیٰ مثال ہے ۔

والد کا وہ اس قدر ادب کرتے تھے جس قدر کہ اب سے دو نسل پہلے ہندوستان کے شریف خاندان کے ممتاز لوگ کیا کرتے تھے ان کی اطاعت اور خدمت گزاری میں انھوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ والدہ مرحومہ کے ساتھ اُن کا ادب اور ان کی اطاعت اور خدمت گزاری اِس سے بھی کچھ بڑھ کر تھی بھائیوں اور عزیز و اقربا کے ساتھ وہ ہمیشہ نہایت محبت کرتے رہے ۔مولوی صاحب کے ایک بھائی (شیخ احمد حسن صاحب) بھوپال میں تھے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مولوی صاحب بھوپال کے اسٹیشن سے گزرے ہوں اور کم از کم ایک روز ٹھہر کر بھائی سے نہ ملے ہوں ۔بھائیوں کی اولاد کی تعلیم و تربیت انھوں نے اس طرح کی جس قدر باپ اپنی اولاد کی کر سکتا ہے۔ حُسنِ اخلاق میں مولوی صاحب ایک فرد فرید ہیں۔ صداقت ان کا فطری جوہر ہے ۔سخاوت اور ایثار میں مولوی صاحب کی ذات ممتاز ہے ۔ ان کی ایک اور ممتاز صفت عزم کی قوت اور ارادہ کا استقلال ہے ۔سیاسیات میں مولوی عبدالحق کا ذہن بہت ... اور ... بہت صحیح ہے لیکن وہ ہمیشہ سیاسیات سے بچنے کی کوشش کرتے رہے مولوی صاحب ہمیشہ اپنے اس قول پر کاربند رہے کہ :

"ہمارے سامنے علم کا دریائے ناپیدا کنار موجود ہے جس میں تمام عمر ہم شناوری کر سکتے ہیں اور غوطے لگا سکتے ہیں اور جس سے غیر محدود حد تک ہم سیراب ہو سکتے ہیں

تو ہمیں اسے چھوڑ کر "پولٹیکس" کی ناپاک دَل دَل میں پھنس کر ہلاک ہونے کی کیا ضرورت۔"

وہ عمر بھر علمی مشاغل میں مصروف رہے۔ فارسی کی تعلیم انھوں نے قدیم رواج کے مطابق گھر پر اور اس کے بعد کالج میں پائی تھی جیدر آباد آئے تو ایک ذی علم مولوی کو نوکر رکھ کر ان سے عربی صرف و نحو اور ادب کی کتابیں پڑھیں۔ ہندی زبان اور ادب پر بھی انھوں نے عبور حاصل کیا۔ اورنگ آباد میں انھوں نے ایک پنڈت سے تُلسی داس کی رامائین وغیرہ پڑھیں۔ دکنی اور گجراتی اُردو جو گجری کہی جاتی تھی، شمالی ہند کی اُردو سے مختلف اور جداگانہ زبانیں ہیں لہٰذا ان دونوں پر بطور خود بے استعانت غیرے عبور حاصل کیا۔

اُنھوں نے خودداری اور عزتِ نفس کو ہمیشہ قائم رکھا۔ فرائض شناسی اور فرائض منصبی کو محنت اور مشقت سے انجام دینے میں مولوی صاحب جیسے لوگ کم ہوں گے۔ ان کی کارگزاری کا اعتراف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ جب ان کی عمر پچپن سال کی ہونے کو آئی تو خود سر رشتۂ تعلیم کے ناظم نواب مسعود جنگ مرحوم نے ان سے توسیع ملازمت کے لیے کہا۔ مولوی صاحب نے "ترقی اُردو" کی دھن میں انکار کیا تو نواب مسعود نے ہر طرح سے عاجز آ کر "بھوک ہڑتال" شروع کر دی اور قسم کھالی کہ جب تک مولوی صاحب توسیع ملازمت پر راضی نہ ہوں گے وہ کھانا نہیں کھائیں گے اور شبانہ روز بھوکے بھی رہے تب مولوی صاحب مجبور ہو گئے لیکن نواب مسعود جنگ کی خدمت سے سبکدوشی کے بعد مولوی صاحب نے بھی آخر وظیفہ لے لیا۔

مولوی صاحب کا نہایت بے بہا اور بہت اہم کارنامہ حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ کا قیام اور اور اس میں اردو کے ذریعۂ تعلیم کا جاری کرنا ہے۔ دارالترجمہ کا قیام اور اس کی تشکیل اور انتظام بھی مولوی صاحب کا کیا ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے بہت مشقت اٹھائی اور نہایت دوربینی سے اس کا انتظام مکمل کیا۔

آخر میں مضمون نگار نے مولوی صاحب سے چالیس سالہ تعلقات اور واقفیت کی بنیاد پر یہ شہادت دی ہے کہ وہ نہ صرف خدا اور رسولِ خدا اور اولیائے خدا سے محبت رکھنے والے

روشن خیال مسلمان ہیں بلکہ مسلمان گر بھی ہیں! (جوہر، صفحہ ۱۷-۲۴)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور:

مولوی عبدالحق صاحب

(زندگی کے سات دور)

مولوی صاحب کی علمی وادبی زندگی کا آغاز حیدر آباد میں ہوا۔ علی گڑھ سے گریجویٹ ہو کر نکلے ہی تھے کہ حیدر آبادی افواج باقاعدہ میں ان کو ملازمت مل گئی۔ لیکن یہاں فوجی کام لینے کی بجائے ان سے رسالہ "افسر" کی ادارت کرائی گئی۔ اس کے بعد رسالہ "حسن" "دکن ریویو" اور "مخزن" وغیرہ میں انھوں نے مقالے لکھنے شروع کیے۔

حیدر آباد ہی میں مولوی صاحب کا دوسرا دور دفتر معتمدی امور عامہ میں بحیثیت مترجم شروع ہوا یہاں ان کو مولانا ظفر علی خاں کے نقش قدم پر چلنے کا موقع ملا۔ دکن میں تیسرا دور، اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی سے شروع ہوتا ہے۔ مولوی صاحب کی زندگی کا چوتھا اور حیدر آباد کا آخری دور مولانا وحیدالدین سلیم کی وفات پر بحیثیت صدر شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ مولوی صاحب کی دوبارہ حیدر آباد میں آمد ہے ان کی زندگی کا پانچواں دور، دہلی میں بسر ہوا تقسیم ملک کے بعد انہیں کراچی جانا پڑا یہ ان کی زندگی کا چھٹا دور پاکستان میں فوجی انقلاب پر مولوی صاحب کی زندگی کا ساتواں دور ختم ہوتا ہے۔

میں مولوی صاحب کو فرشتہ نہیں، انسان سمجھتا ہوں اور ایسا انسان، جو اپنی دھن کا پکا اور جذبۂ خدمت گزاری میں سرشار ہے۔ (مجلس، صفحہ ۱۳۹—۱۴۳)

ایم، اے حفیظ - گلشن آبادی :

ڈاکٹر عبدالحق

یہ مضمون مولوی عبدالحق کے مختصر سوانحی خاکے پر مشتمل ہے۔

۱۸۹۴ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے بی۔اے کی ڈگری لی۔ اس زمانے میں انہیں کتب خانہ پن چکی اور رنگ آباد دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت اورنگ آباد تک ریل جاری نہ ہوئی تھی۔ اس لیے احمد نگر کے راستے وہ اورنگ آباد پہنچے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی یہ کتب خانہ لٹ چکا تھا۔ اور یہاں انہیں چند دکنی کتب کے سوا کچھ نہ ملا۔

بی۔اے میں اُن اختیاری مضامین فلسفہ اور تاریخ تھے لیکن ریاضی کے بھی بڑے اچھے طالب علم تھے۔ اس میں ان کا مقابلہ سر ضیاء الدین مرحوم سے بھی رہا۔ بیس برس سے کم عمر ہی میں شمس العلماء مولوی خلیل احمد انہیں فلاسفر کہنے لگے تھے۔

کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے عربی ادب، صرف، نحو، زبانِ ہندی و ادبِ دکنی اور گجری زبان پر عبور حاصل کیا۔ اس کے علاوہ فارسی اور انگریزی ادب میں بھی کمال حاصل کیا۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل نوجوانوں کی ایک سوسائٹی نواب محسن الملک کی سرپرستی میں جو ان دنوں عارضی طور پر بمبئی میں بنائی گئی۔ جس میں ظفر علی خاں، محمد امین زبیری اور ڈاکٹر عبدالحق شامل تھے لیکن چند برسوں کے بعد بمبئی میں پلیگ کی وبا پھیل گئی تو یہ سوسائٹی درہم برہم ہو گئی محمد امین زبیری بھوپال اور ظفر علی خاں اور ڈاکٹر عبدالحق حیدر آباد دکن آ گئے۔

اسی دوران نواب ممتاز یار دولہ نے "اصلاح تمدن" کے نام سے ایک کمیٹی بنائی جس کے سیکرٹری عبدالحق بنائے گئے۔ کچھ عرصہ بعد معتمدی عدالت و امور عامہ میں مترجمی کی خدمت پر مامور

ہوئے لیکن نواب سربلند جنگ حمید اللہ خاں مرحوم عبدالحق کے علمی مذاق سے خوب آشنا تھے۔ انھوں نے سررشتۂ تعلیمات میں بلا لیا اور مولوی محمد عزیز مرزا کی معتمدی کے زمانے تک یہ کام انجام دیتے رہے اس کے بعد مہتمم تعلیمات ضلع اورنگ آباد ہوئے اور پھر صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات مقرر ہوئے اب سارے صوبے کے چار اضلاع ان کی نگرانی میں آ گئے۔ انھوں نے اس خدمت پر کوئی بارہ سال گزارے اور صوبہ اورنگ آباد کے ماتحت اضلاع و تعلقات اور دیہات میں دورہ کر کے جو خصوصی کام انجام دیا، ان میں مدرسوں کے معائنے، اردو کے اچھے استادوں کو مامور کرنا، انہیں پڑھانے کا ڈھنگ سکھانا اور قریہ بہ قریہ اُردو دوستی اور اس کی ترقی کا علم بلند کرنا ہے جس کا ثبوت ان اضلاع کے مدارس کے ریکارڈ اور رجسٹروں سے ملتا ہے۔ صدر مہتمی اورنگ آباد سے دارالترجمہ حیدرآباد کی نظامت پر ترقی دی گئی جہاں چند سال تک رہے اس کے بعد ان کو اورنگ آباد کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا یہاں انھوں نے خود اُردو پڑھانا شروع کیا اور اساتذہ پر بطورِ خاص نگرانی رکھی، ان میں انشا پردازی کی لگن اور اُردو کا ذوق و شوق پیدا کرنے کے لیے ۱۹۲۵ء میں ایک سہ ماہی رسالہ "نورس" جاری کیا۔ ۱۹۳۰ء میں اس خدمت سے سبکدوش ہوئے لیکن مہاراجہ سرکشن پرشاد صدر اعظم کے اصرار پر انہیں جامعۂ عثمانیہ میں اُردو زبان و ادب کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ چھ سات سال تک پروفیسری کرنے کے بعد استعفیٰ دے دیا کیوں کہ یہاں کام کم تھا اور یہ سرگرمی اور تیزی پیدا کرنے کے لیے انجمن ترقی اُردو کا صدر مرکز دہلی قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ مرکز کی تمام شاخوں پر نگرانی ہو سکے اس طرح ۱۹۳۸ء میں دہلی کو اپنا مستقر بنا لیا اور یہاں سے خالی ہاتھ پاکستان گئے۔

(نورس، کراچی، صفحہ ۹۶ – ۱۰۰)

نصیر الدین ہاشمی:

حیدر آباد میں مولانا ڈاکٹر عبد الحق کی خدمات

(ایک طائرانہ نظر)

اوّلاً حیدر آباد میں مولوی صاحب مدرسہ آصفیہ کے ہیڈ ماسٹر اور رسالہ "افسر" کے ایڈیٹر رہے۔ پھر غالباً مترجمی کی خدمت پر ہوم سکریٹریٹ میں منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد مولانا سر رشتۂ تعلیمات میں چلے گئے اور مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے ضلع اورنگ آباد میں آپ کا تقرر ہوا۔ کئی سال کے بعد صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات ہوئے۔ اب پورے صوبے کی چار اضلاع آپ کی نگرانی میں آ گئے۔ صدر مہتمی تعلیمات سے آپ کو دار الترجمہ کی نظامت پر ترقی دی گئی۔ چند سال یہاں جامعہ عثمانیہ کے لئے کتابیں ترجمہ اور تالیف کرانے کا اہم کام آپ کے ذمہ رہا۔ اس کے بعد آپ اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی پر چلے گئے۔ یہاں ہی آپ کی عمر ۵۵ سال کی تکمیل ہوئی اور وظیفہ حسن خدمت مل گیا مگر اس کے بعد آپ کو جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اُردو کی صدارت قبول کرنی پڑی۔ چند سال کے بعد اس خدمت سے سبکدوش ہو کر آپ دہلی چلے گئے۔ انہوں نے علمی خدمت کو اپنا شعار بنایا اور عمر بھر متعلم رہنا پسند کیا اور اس پر گھومتے رہے اگرچہ حیدر آباد کی سیاست کے لحاظ سے مولانا کے موافق اور ناموافق زمانے آئے مگر انھوں نے زندگی کا جو نصب العین، علم کی خدمت کو قرار دیا تھا، اس پر جمے رہے اور حیدر آباد کی پوری ملازمت کا زمانہ اس کی نذر کر دیا۔

نظامتِ دار الترجمہ کے زمانے میں آپ نے بہترین مترجمین کو جمع کیا اور اچھی کتابوں کا ترجمہ کرانے کی کوشش کی اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی اور صدر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ کے زمانے میں آپ نے جن طلبہ پر توجہ فرمائی وہ آگے چل کر ہم چشموں میں ممتاز اور نامور ہوئے۔ یہ تھا حیدر آباد کی سرکاری ملازمت کا احوال۔

حیدر آباد کی ملازمت کے دوران آپ کی علمی خدمات کا مختصر جائزہ یوں ہو سکتا ہے۔ حیدر آباد کی ملازمت کے زمانے میں آپ کو انجمن کا سیکرٹری چنا گیا۔ انجمن کی خدمات مولوی صاحب سے الگ نہیں۔ مولانا نے حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں کئی کتابوں پر مقدمے لکھے اور کئی کتابیں تصنیف و تالیف فرمائیں بلکہ آپ کی تصانیف کا بڑا حصہ حیدر آباد ہی کی یادگار ہے۔ مولانا کا حیدر آباد میں سب سے بڑا علمی کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے آپ ہی نے اس کی اسکیم مرتب کی۔ اس کے لیے کتابوں کو فراہم کیا۔ اس کے لیے اُردو پڑھانے والے اساتذہ کو مہیا کیا۔ مترجمین اور اساتذہ میں قاضی محمد حسین چودھری برکت علی، مرزا رسوا، الیاس برنی، وحید الدین سلیم، عبداللہ عمادی، خلیفہ عبدالحکیم، ہارون خاں شیروانی وغیرہ جیسے اصحاب کا مل جانا، مولوی عبدالحق کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مولانا نے حیدر آباد میں جو علمی خدمات انجام دیں ہیں وہ بہت تابناک ہیں۔ انھوں نے اپنے علمی ذوق اور اُردو کی محبت میں حیدر آباد کی ایسی خدمت کی ہے جس پر نسلیں فخر کر سکتی ہیں۔

آخر میں ہاشمی صاحب نے معترضین کے اس سوال کا جواب دینا چنداں ضروری خیال نہیں فرمایا کہ مولانا نے اپنے مستقر کے لحاظ سے اورنگ آباد کو انجمن کا صدر مقام بنایا تھا لیکن جب وہ حیدر آباد آگئے اور کئی سال رہے تو کیوں اس کا مستقر نہیں بدلا؟ اور یہ کہ حیدر آباد میں انجمن کی کوئی شاخ کیوں قائم نہیں کی گئی؟ (الشجاع صفحہ ۵۱ — ۵۹)

مولوی سید غلام ربانی :

مولوی عبدالحق صاحب

بحیثیتِ معتمد انجمن ترقیٔ اُردو

مضمون نگار نے، انجمن کے معتمد کی حیثیت سے مولوی صاحب کی خدمات کا سولہ سترہ سالہ جائزہ پیش کیا ہے۔

انجمن ترقی اردو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا علمی شعبہ تھا۔ یہ شعبہ جنوری ۱۹۰۳ء کو بمقام دہلی کانفرنس مذکور کے غیر معمولی اجلاس میں قائم ہوا۔ شبلی اس کے آنریری سیکرٹری قرار پائے۔ آپ نے بعض مجبوریوں کی وجہ سے اسے چھوڑا تو یہ کام مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو تفویض ہوا لیکن انہیں مجبوریوں کی وجہ سے جو شبلی کو پیش آئی تھیں، آپ نے بھی دست کشی اختیار کی تو یہ خدمت مولوی محمد عزیز مرزا کے سپرد کی گئی۔ انہوں نے بڑی مستعدی سے کام شروع ہی کیا تھا کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔

مولوی عبدالحق صاحب کا اس خدمت کے لیے انتخاب ہوا تو ایک پرانا صندوق تھا جو شکستہ ہونے کی وجہ سے رسی سے کسا ہوا تھا۔ اس میں ایک رجسٹر تھا اور ایک قلم دوات — یہ تھی کل کائنات انجمن ترقی اردو کی، جو اس نے اپنے معتمدِ چہارم کے حوالہ کی۔

اس وقت تک انجمن کے ارکان تین قسم کے تھے:

۱۔ سرپرست، اُمراء و رؤسا، جو انجمن کو یک مشت ایک ہزار روپے عطا فرمائیں۔

۲۔ ارکانِ مدامی، جو یک مشت پان سو روپیہ عنایت فرمائیں۔

۳۔ ارکانِ شوریٰ، وہ نامور اربابِ قلم و صاحبانِ علم و فن، جن کی خدمت میں انجمن کے ادبی و علمی امور مشورتاً پیش کیے جائیں۔

ارکانِ شوریٰ کی فہرست ضرور اچھی خاصی طویل تھی لیکن اس وقت تک سرپرست اور ارکان مدامی کی فہرست میں کوئی نام نامی درج نہیں ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے ایک قسم ارکانِ معمولی کی اضافہ کی، جن کے لیے لازم تھا کہ ایک روپیہ ماہانہ یا بارہ روپیہ سالانہ عنایت کریں۔ آپ نے پہلے ہی سال ۸۴ رکن بنائے اور پربھنی (حیدر آباد) میں انجمن کی ایک شاخ اور کتب خانہ قائم کیا۔ دوسرا اہم کام جو اس سال آپ نے انجام دیا، تھا کہ نواب عماد الملک کو انجمن کا صدر بنایا۔

دو سال بعد یعنی ۱۹۱۵ء میں ارکانِ اعانت کی تعداد ۳۰۰ تک پہنچ گئی اور ساتھ ہی کچھ کتابیں بھی شائع ہو گئیں۔ آپ کے اثر سے ملک کے مشہور اخبارات میں انجمن کی حمایت میں پُرزور مضامین نکلنے شروع ہوئے۔

ابتدا میں نواب عماد الملک کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نظام نے انجمن کی سرپرستی قبول فرمائی اور بارہ سو

روپے سالانہ منظور ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں سر اکبر حیدری کی مساعی سے اعلیٰ حضرت نظام نے مستقلاً انجمن کے لیے پانچ ہزار روپے سالانہ کی امداد مرحمت فرمائی اسی سال علیا حضرت مرحومہ فرمانروائے بھوپال نے پچاس روپے ماہانہ کی مستقل امداد عطا کی۔ اب ارکانِ اعانت کی تعداد ۴۰۹ تک پہنچ گئی اور کلکتہ، جالنہ اور بمبئی میں انجمن کی شاخیں اور کتب خانے قائم ہوئے اور مطبوعاتِ انجمن کی تعداد ۱۶ تک پہنچ گئی جن میں دریائے لطافت، مشاہیر یونان و روما، تاریخ تمدن اور فلسفۂ تعلیم جیسی نادر کتابیں شامل تھیں۔ لوگوں کو کثرت سے انجمن کا رکن بنانے اور انجمن کے مقاصد اور مطبوعات کی اشاعت میں آسانی کے پیشِ نظر ارکانِ اعانت کا سالانہ چندہ بجائے بارہ روپے کے چھ روپے اور ان کو دورانِ رکنیت انجمن کی مطبوعات نصف قیمت پر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ ۲ ہی سال میں ارکان کی تعداد ۳۲۳ تک پہنچ گئی۔ اسی سال (دسمبر ۱۹۱۶ء) انجمن ترقی اردو کا ایک عام جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ جلسہ میں ہندوستان بھر کے علماً، فضلاً، اکابرِ قوم، شعراً ادبا، مشائخ اور روٴسا عظام تک شریک ہوئے اس طرح انجمن کا اشتہار ہو گیا۔

۱۹۱۷ء میں شیدایانِ اردو کی تعداد ۲۰۰ ہو گئی۔ اب تک ارکانِ مدامی کی فہرست میں کوئی اسم گرامی درج نہیں ہوا تھا، اس سال گیارہ بہی خواہانِ اردو نے اس معزز رکنیت کو قبول فرمایا۔ اسی سال اصطلاحات علمیہ کی ایک لغت تیار کرنے کے لیے سرکار نظام نے تین سال تک تین ہزار روپے کی امداد منظور فرمائی۔ اس سال مطبوعاتِ انجمن میں چار اور نئی قابلِ قدر کتابوں کا اضافہ ہوا۔ مختلف صاحبانِ اخبار اور تاجرانِ کتب سے معاملہ طے کر کے سترہ شہروں میں بیس ایجنسیاں قائم کی گئیں جس سے کتب کی فروخت میں نمایاں ترقی ہونے لگی۔ ۱۹۱۸ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن کی سفارت پر حاجی مظہر علیم انصاری (مرحوم) کو بہار، بنگال، صوبجات متوسط مالوہ، راجپوتانہ، میواڑ، گجرات اور کاٹھیاواڑ کے دورے پر بھیجا۔ اس ذریعے سے ارکان کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ان دور افتادہ خطوں میں انجمن کی شاخیں اور کتب خانے قائم ہو گئے۔

۱۹۱۹ء میں ارکانِ اعانت کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور تعداد ۴۳۳ ہو گئی۔ ارکانِ مدامی ۳۴ اور انجمن کی شاخیں اور کتب خانے ۳۰ ہو گئے۔ ملک میں مطبوعاتِ انجمن مقبول ہونے

لگیں چنانچہ ۱۹۲۰ء میں فلسفۂ تعلیم، علم المعیشت، انتخاب کلام میر اور فلسفۂ جذبات دوسری بار طبع ہوئیں۔ (۱۹۳۰ء تک انجمن کی بعض کتابیں تین تین چار چار مرتبہ چھپیں) ۱۹۳۰ء ہی سے تمام مطبوعات مجلد شائع ہونے لگیں۔ جنوری ۱۹۲۱ء کے پہلے ہفتے سے رسالہ "اُردو" کا اجرا ہوا اور انجمن کے حسابات کی تنقیح کا انتظام کیا گیا۔ ۲۳-۱۹۲۲ء میں چند نئی کتابیں طبع ہوئیں۔ ارکانِ دائمی کی تعداد ۸۰ اور اتنی ہی شاخیں اور کتب خانے قائم ہوگئے۔ انجمن مولوی صاحب کے مکان سے اپنے مکان "اُردو باغ" میں داخل ہوئی۔ ۲۵-۱۹۲۴ء میں بشمولِ فرہنگ چھ کتابیں شائع ہوئیں۔ انگریزی اُردو لغت کے لیے ایک کمیٹی مقرر کردی گئی۔

اسی دوران مجلسِ نظمائے انجمن قائم ہوئی۔ ۱۹۲۴ء سے انجمن نے کتابوں کی ایجنسی کا کام بھی شروع کر دیا۔ اسی سال "اُردو باغ" میں ٹائپ کا پریس قائم ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں نواب عماد الملک کے انتقال پر مجلسِ نظمانے نواب مسعود جنگ کو انجمن کا صدر منتخب کیا۔ ۱۹۲۷ء میں پانچ کتابیں شائع ہوئیں اسی سال انجمن نے مدارس کے لیے ریڈریں تیار کرانا شروع کیں۔ انگریزی اُردو لغت کا ترجمہ مکمل ہوا۔ نظرِ ثانی شروع ہوئی اور بیشتر گراں قدر عطیے میسر آئے۔

۱۹۲۸ء میں ارکانِ مدامی کی تعداد ۱۰۰ ہوگئی۔ انجمن کی شاخیں اور کتب خانے ۹۹ تک پہنچ گئے۔ جدید تالیفات و تصنیفات کے ساتھ ساتھ قدیم کلام نظم و نثر کو محفوظ کیا۔ آپ نے دریائے لطافت، نکات الشعرا، مثنوی خواب و خیال، تذکرہ شعراء اردو (مصحفی) اور سب رس وغیرہ اور بعض نایاب و نادر کتابیں کھود کھود کر نکالیں۔ اور زبانِ اُردو کی تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ قدیم دکنی اردو کی کتابوں کی ترتیب کے ساتھ قدیم دکنی الفاظ کی فرہنگ بھی مرتب کی۔ قدیم قلمی نسخے نہایت تلاش و جستجو سے نیز مختلف مقامات کا سفر کر کے مہیا کیے۔ ۱۹۲۸ء ہی میں رسالہ "سائنس" کا اجرا ہوا۔

انجمن ترقی اُردو کی کہانی عزم و استقلال، محنت و ہمدردی اور خلوص و ایثار کی کہانی ہے۔ اس کے ہیرو کی پاک اور بلند مرتبہ سیرت ملک کے لیے ایک نعمت ہے۔ اس کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا ہے۔ اس کی سرگرمیوں اور مستعدیوں کو دیکھ کر دل میں اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ اس کی

نیک نفسی، شرافت اور خاموشی میں ایک جادو ہے۔ اس کی زندگی کا ہر لحظہ اردو کی ترقی کے خیال میں گزرتا ہے اور یہی وہ اسباب ہیں کہ انجمن کے باغ کی خزاں، سدا بہار سے بدل گئی ہے اور اب اس کی قلمیں ملک کے کونے کونے میں لگائی جا رہی ہیں۔ قوم کو اب یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ اس میں ہمدردی اور خلوص سے کام کرنے والے موجود نہیں بلکہ قوم سے یہ شکوہ ہو سکتا ہے کہ آٹھ کروڑ میں سے اب تک آٹھ لاکھ نہیں آٹھ ہزار نہیں صرف آٹھ سو حضرات بھی انجمن کو ایسے نہیں مل سکے جو اپنی زبان کی ترقی کے دل سے خواہاں ہوتے۔ زبانِ اردو کی ترقی، ملک کی علمی ترقی ہے اور انجمن کا آخری مقصد ملک میں ایک اتحاد اور عالمگیر محبت پیدا کرنا ہے۔ بہت مبارک ہیں وہ حضرات جو انجمن کی مدد کرتے اور اس کے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں ــــ

(نورس، اورنگ آباد، صفحہ ۸۱ ــــ ۱۱۲؛ جوہر، صفحہ ۶۶ ــــ ۱۰۱)

سیرت و شخصیت

پروفیسر الیاس مجیبی:

اردو باباعبدالحق

بوڑھے عبدالحق کو دیکھ دیکھ کر پچھلے فردوس نشین بزرگوں کی یاد تازہ ہوتی ہے اب ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہ جیسے بھلا کاہے کو پیدا ہوں گے۔ رہ رہ کے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ میاں نے شاید ایسی روحوں کو تختۂ زمین پر بھیجنا بند کر دیا ہے۔ اس لیے کہ ہم سب نے اسے بہت گندہ بھی تو کر دیا ہے۔

بڑے ٹھاٹھ بڑے کرّ و فر اور بڑے ہی طنطنے رہتے تھے کبھی ان ہی بڑے میاں کے۔ ایسے کہ بڑے بڑوں کو ڈانٹ دیتے، بے تکی، بے تمیزی کی بات پر جو بگڑ گئے کسی سے تو کھڑے کھڑے بنگلے سے نکلوا دیا۔ زد میں آجانے والے دکن کے بڑے بڑے عہدہ دار بھی رہے جو بہت جلے کڑھے لیکن مولوی صاحب کا بال بیکا نہ کر سکے۔ اُن کی سیرت کا ایک پہلو یہ رہا، دوسرا یہ کہ چھوٹوں ہم ایسوں پر کبھی رعب نہیں جمایا، بلکہ بعض بڑے لوگوں کی اسی کمزوری کا مذاق اڑاتے ہوئے پائے گئے۔ بڑے بڑوں سے مولوی صاحب کبھی مرعوب نہ ہوئے بے جا تملّق اُن سے کبھی بن ہی نہ پڑا لیکن دوسری طرف یہ شان کہ چھوٹوں کا انہوں نے ہمیشہ دل بڑھایا، احسان و کرم اور تواضع میں کبھی چھوٹے بڑے میں امتیاز نہیں برتا۔

انجمن کو اپنے ہاتھ میں لیا تو لے دے کے ایک رجسٹر تھا، مراسلوں، خطوں وغیرہ کے اندراج کے لیے ایک رجسٹر، شاید روئیدادوں کے اندراج کے لیے تھا اور ایک شاید فہرست ارکان کا بس یہ تھی انجمن ترقیٔ اردو — مولوی صاحب نے شبانہ روز اپنی جان کھپادی، تب انجمن نے ایک باضابطہ باوقار ادارے کی شکل پائی، انجمن کے حساب و کتاب میں کسی کی رُو رعایت کی، نہ مروّت برتی، دوسری طرف اتنے لکھ لٹ اور دوست نواز غریب پرور کہ ذاتی روپے کو عزیز کبھی نہ رکھا، ویسے بھی پیسے کے لوبھی کبھی رہے نہ ذاتی مفاد و اقتدار حاصل کرنے کے پیچھے پڑے۔ ذاتی خرچ میں بڑی مد پرانے مخطوطات کی خریداری کی رہی۔ ناداروں، کھلے مانسوں کی مدد معاش پر ہو یا ہونہار طلبہ کی اعانت پر بے دریغ خرچ کرتے رہے۔ غرض کہ اپنے وقت کے

حاتم و شاہ جہاں اور اپنے وقت کے میر تقی میر کی یہ شان و شوکت اور یا پاکستان شریف میں اُن کی یہ نوبت کہ میں نے اپنی آنکھ سے مولوی صاحب کو پھٹی پرانی گون پہنے دیکھا اور دل خون ہو کر رہ گیا۔

مولوی صاحب نے شادی کی نہ وہ بیوی بچوں کے رگڑے میں پڑے، نہ دوسروں کو ان جھمیلوں میں پڑتے ہوئے پسند کرتے تھے۔

سفر میں خاص کر شگفتگی زیادہ پائی جاتی رہی مگر یہ نہیں کہ حضر میں کڑوا کریلا رہتے ہوں اسی بات پر مولوی صاحب کی سیرت کا جذباتی پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا کوئی ضروری کاغذ یا کتاب بر وقت نہ مل سکی تلاش و جستجو میں مولوی صاحب کا قیمتی وقت ضائع ہوا اور اب ان کا پارہ چڑھا۔ ایسے مواقع پر مولوی صاحب سے نپٹنا کٹھن مرحلہ رہا ہے۔

جوانی میں کبھی مولوی صاحب کو درد گردہ کی شکایت اور تکلیف ہو جاتی تھی۔ علاج معالجے کے سلسلے میں کسی کا یہ مشورہ مولوی صاحب کا معمولِ حیات بن گیا کہ صبح و شام میلوں ٹہلا کرتے تھے ہمیشہ گھپ اندھیرے سے جاگ جاتے اور ٹہلنے نکل جاتے، میلوں کے چکر لگاتے، واپسی پر سیدھا غسل خانے میں جا نہاتے، غسل خانے سے گون پہن سیدھے میز پر آجمتے، جب تک چائے لگے، بہتیرے خطوط کا جواب لکھ ڈالتے آمدہ خطوط کے جوابات لکھنے کے مولوی صاحب ہمیشہ پابند رہے اس بات میں انھوں نے کبھی بخل سے کام لیا نہ اپنی مصروفیتوں کا مظاہرہ کیا۔

انرجی (مستعدی) کی فراوانی گویا دیدنی تماشہ ہے کہ اور کہیں دیکھنے میں نہ آیا وہ ہی صبح نو، دس بجے سے میز پر جھک پڑے، دوپہر میں قدرے قلیل تازہ پھل ٹونگ لیے، برائے نام قیلولہ کیا، یا تازہ اخبار پڑھا اور پھر کام، کام، کام!

یہ بوڑھا اول دن سے بڑا آدمی نہیں بنا، جوانی میں بہت کھکھیڑیں سہیں مگر ہمت نہ ہاری کبھی دل و دماغ پر مایوسی غلبہ نہ پا سکی، دھیرے ہی دھیرے راہیں کھلیں، آگے بڑھنے کی شکلیں اللہ نے دکھائیں پھر بھی بڑے بڑوں کے لیے کولہو کا بیل بنے رہے، دوسروں کے لیے لکھنے پڑھنے یا تراجم کا اتنا کام کیا جس کا شمار ہے نہ اس کا ریکارڈ محفوظ ہے۔ اپنی ان خدمتوں اور اپنے بے شمار مفید و کارآمد کاموں کے صلہ میں اپنے

مستقبل کی تعمیر کی جگہ۔ انجمن ترقی اُردو کو سامنے لا رکھا اور یہ سب کچھ اُردو کی خاطر۔ اُردو کی خاطر ہر اعلیٰ و ادنیٰ اقدام کے لیے آج بھی مستعد رہتے ہیں اور اسی سلسلے میں کچھ مداریوں، تماشا کرنے والوں کے ہاتھوں بھولے اُردو بابا، خود تماشا بھی بن گئے ہیں!

مولوی صاحب اعلیٰ پایہ کے نیشنلسٹ رہے۔ سرکاری ملازمت اور ملازمت بھی حیدر آباد کی، پھر بھی یہ کھدر پہنا کیے۔ ہمیشہ سے اُن کے پیش نظر قوم اور ملک کی فلاح و بہبود رہی۔ گاندھی کی سوجھ بوجھ کے قائل تھے۔ فرمایا کرتے لیڈر عموماً جذباتی ہیں، گاندھی ہی جیسے ٹھنڈے آدمی کی ضرورت ہے۔ اسی لیے مولوی صاحب محمد علی مرحوم کی خدمات اور ان کی قربانیوں، جرأتوں کی قدر و قعت کرنے کے باوجود مرحوم کے زیادہ قائل نہ رہے۔ مولوی صاحب یا تو حکیم اجمل خاں مرحوم کو مانتے رہے یا گاندھی جی کو۔ وہ تو گاندھی جی اُردو ہندی کے معاملے میں بہکے کہ بعد میں پچھتاتے بھی رہے جیسا کہ پنڈت سُندر لال جی ایک بار فرماتے تھے۔ خود گاندھی جی شاید مولوی صاحب کی شخصیت سے واقف نہیں رہے۔ پہلے پہل یوں ہی سا کوئی عربی مدارس کا سادہ سا مولوی سمجھے، دھوکے میں رہے، بات خاصی بڑھ گئی۔

مولوی صاحب کے ایما سے جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی تو دار الترجمہ کے پہلے ناظم مولوی صاحب ہی بنائے گئے۔ مولوی صاحب نے بہتیرے ذی علم لوگوں کو محض اپنے ذاتی اثر اور روابط اور اپنے رکھ رکھاؤ کے بل بوتے پر جمع کر لیا کام شروع ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اراکینِ ادارہ پلنگوں پر پڑے کام کرتے اور ساتھ ہی حقے بھی چلتے۔ کام اور گپّیں بھی کرتے، روڑے اٹکانے والوں نے رپورٹیں جڑنی شروع کیں بات اعلیٰ حضرت نظام تک پہنچی اور انکوائری کے احکام جاری ہوئے۔ متعلقہ عہدہ داروں نے گویا مولوی صاحب سے جواب طلب کیا، انھوں نے بے دھڑک کورا جواب دیا کہ تالیف و تصنیف کے کام ہمارے یہاں اسی شان سے ہوتے رہے ہیں اور برائے چندے اسی ڈھنگ سے ہوں گے آپ بھلا کیا جانیں کہ مصنّف و مؤلف کوئی انجن یا مشین تو نہیں، تیل ڈالا، کوئلہ جھونکا، انجن گرما لیا بٹن دبایا اور کام چلنے لگا۔

مصنف یا مؤلف کی طبیعت حاضر ہونا شرطِ اوّل ہے۔ وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے بھی ہو سکتی ہے

اور یہ اکثر ہوتا ہے کہ لیٹے لیٹے بھی لکھا پڑھا جاتا ہے۔ غرض کہ اس کے لیے باضابطہ میز کرسی پر جم لازمی نہیں، چاہئیے بس یہ جواب ہے میرا، اسے میں جانتا ہوں۔ اس کو جاننا آپ تو آپ اعلیٰ حضرت کا بھی منصب نہیں اور کسی کا ذکر ہی کیا۔ یہ رپورٹ پیش ہوئی، لگائی بجھائی کرنے والوں نے حاشیے بھی چڑھائے لیکن اعلیٰ حضرت نظام نے فرمایا "اردو کا منشی عبدالحق سچ کہتا ہے۔ یہ حرام کے اچھے لوگوں کو کام نہیں کرنے دیتے۔"

مولوی صاحب کھانے پینے کا بڑا ہی ستھرا، اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ وہ خود ہڑوس کبھی نہ رہے بہت ہی ذرا بھی کھاتے، ہاں دوسروں کو کھلانے پلانے میں زیادہ حلاوت پاتے رہے۔ چائے مولوی صاحب بڑھیا ہی پیتے رہے اور سلیقے سے گنوارپن سے چائے پینا پسند نہ فرماتے رہے۔

مولوی صاحب کو ایک بات سے چڑسی ہے کہ وہ اپنے حالات خود لکھ کر نہیں دیتے رہے —— یہ پرانی قدروں کے سچے قدردان ہی نہیں خود سچے جانشین ہیں۔ پُرانے فردوس نشین بزرگوں کے، مگر زمانے کی نئی نئی چالوں اور نئی تراش خراش سے بدکتے بھی نہیں اور نئی نئی قابل قدر چیزوں کی بھی صدق دل سے قدر کرتے ہیں، ساتھ ہی نوجوانوں پر دوسرے بڑے بڑھوں کی طرح اپنی بزرگی کی دھونس بھی نہیں جماتے۔

مولوی صاحب کا دل دھلے کپڑے جیسا اُجلا ہے جو چاہے وہ اس پر اپنا ٹھپّہ چھاپ لے۔ وہ آج بھی سپاہی ہیں جنرل ہیں، تدبیر و سیاست انہیں بس اتنی آتی ہے کہ ہر کسی پر بھروسہ کر لیتے ہیں اس درجہ کہ وہ پھر بات کی تہہ معلوم کرنے کو نہیں پڑتے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی اور کے بارے میں یہ بات اُن کے دل میں بٹھادی کہ یہ کام کرنے سے جی چراتا ہے تو پھر مولوی صاحب آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

مولوی صاحب کو رسوا کرنے والے اُن کے بعض نام نہاد احباب رہے۔ لوگوں نے انہیں استعمال کیا اُن کا سہارا لے کر دوسروں پر اپنا رعب جمایا اور جب مولوی صاحب کو بنانا کٹھن جچا تو دوسرا ٹھکانہ تاک لیا اور بڑی شان سے کھسک لیے، آج تک یہی تماشہ جاری ہے اور مولوی صاحب کو لوگوں نے تماشہ بنا رکھا ہے افسوسناک سیاست گری ہے جو ہمہ وقت مولوی صاحب کے گرد و پیش چھائی رہتی ہے وہ بھلے مانسوں کی طرح کام کرنا چاہتے ہیں اور نہ خواہ مخواہ کسی سے اُلجھنا چاہتے ہیں مگر اللہ کے بندے اپنی اغراض کے تحت مسئلہ الجھائے رکھتے ہیں۔

(نقوش، کراچی، صفحہ ۶۲ —— ۶۷)

پنڈت ونشی دھر جی ودیالنکار:

پرنسپل نانک رام بھگوانداس سائنس کالج

سچّا ہیرا

چالیس سال سے اوپر کا عرصہ ہو چکا ہے کہ عالی جناب مولوی عبدالحق صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات ایسی ہوئی کہ اُن سے زندگی بھر کے لیے میرے تعلقات قائم ہو گئے۔ اُن کا مشاہدہ اتنا گہرا ہے کہ اُن سے کسی بات کو چھپائے رکھنا مشکل ہے ایک طرف اُن میں بے حد متانت اور سنجیدگی ہے اور دوسری طرف وہ بڑے زندہ دل اور خوش مزاج ہیں۔ بات کہنے میں وہ بے لاگ مگر ساتھ ہی پہلو میں ایک ہمدرد اور محبت بھرا دل رکھتے ہیں انہیں تصنّع اور بناوٹ سے چڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں سادگی ہے جو ایک عظیم ہستی کی شان اور سچا جوہر ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب شعر و سخن اور فنونِ لطیفہ کے سچے قدر دان ہیں۔ اُن کی قدر دانی زبانی نہیں ہوا کرتی وہ فن کار کے لیے اپنی زندگی کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مَیں ایسے بہت سے فنکاروں، ادیبوں، شاعروں، مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ایسے طلبا، اساتذہ، لیکچراروں اور پروفیسروں کو جانتا ہوں، بہت سے ڈاکٹروں اور عہدیداروں سے واقف ہوں جن کی مدد میں مولوی صاحب نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور جنہیں مولوی صاحب کی مدد کے بغیر موجودہ مرتبہ و مقام کبھی حاصل نہ ہوتا۔ بابائے اُردو دھول میں سے ہیرا اُٹھانا جانتے ہیں اور مدد ہمیشہ انتہائی خاموشی سے کرتے ہیں۔

موج میں آنے پر وہ کبھی شاعری بھی کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری اپنے ہی ڈھنگ کی ہے۔ وہ اوزان اور بحور سے بے نیاز ہوتی ہے۔ اُن کی ایک نظم کے کچھ بول مجھے اب بھی یاد ہیں۔

سب سے پکا

سب سے سچا

دوست، کتاب

سب سے بڑا

سب سے کڑا

معلّمِ زمانہ

مولوی صاحب کی نظم خوانی کا ڈھنگ نیا اور انوکھا ہے۔ وہ شعر کو بہت آہستہ اور اس طرح پڑھتے ہیں کہ اس کی خوبیاں آسانی سے نمایاں ہو جاتی ہیں۔ وہ داغ کے اس شعر کو اکثر سنایا کرتے تھے ؎

ان کے جلوے کے تو کیا کہنے مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیئے

وہ اگر کسی چیز کو اپنے دوستوں سے بھی چھپاتے ہیں تو وہ ہے ان کی تکلیف۔ وہ بیمار پڑنے کو جرم سمجھتے اور ہنس کر کہا کرتے کہ اگر میں کسی کو سزا دینا چاہتا ہوں تو ان لوگوں کو جو اکثر بیمار رہتے ہوں جب کسی کو اچھی صحت میں دیکھتے تو انہیں بے حد خوشی ہوتی۔

اُن کے ہاں زندہ دلی، حاضر جوابی اور ذہانت کے عنصر بہت تھے۔ وہ وقت کی بڑی قدر کرتے تھے لیکن وہ اپنے پاس کبھی کوئی گھڑی نہیں رکھتے تھے، نہ جیبی، نہ کلائی۔ میں نے اُن کے گھر پر بھی کوئی کلاک یا ٹائم پیس نہیں دیکھی لیکن اُن کے سب کام کچھ اس باقاعدگی سے ہوتے تھے کہ وہ بغیر گھڑی کے وقت کا پتہ لگا لیتے تھے۔

مناظرِ قدرت سے انہیں والہانہ لگاؤ تھا۔ میں اُن کے ساتھ دیو بن گیا ہوں۔ وہ صبح شام اونچے پہاڑوں پر اس طرح گھومتے اور چلتے کہ کوئی نوجوان بھی اس طرح نہ چل سکتا تھا۔ ٹہلتے ہوئے جب وہ اونچے درختوں کو دیکھتے تھے تو ان سے لپٹ جاتے اور کہتے کہ یہ تو اتنے اونچے ہیں کہ انہیں دیکھوں تو ٹوپی گر جاتی ہے۔ ٹہلتے ہوئے جب کسی خوبصورت مقام پر آ جاتے تو سب کچھ بھول کر بے خود ہو جاتے اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے انہیں اپنی باتوں پر خود ہنسی آنے لگتی تھی۔

وہ کسی خوبصورت مقام پر رہیں اور وہاں اپنے دوستوں کو ہزاروں تکلف کی چیزیں کھلائیں، انہیں خوش اور ہنستے ہوئے دیکھیں، انہیں اس خیال سے بڑی مسرت ہوتی تھی ـــــ اورنگ آباد میں ان کے

رہنے کا مقام سچ مچ ایک ایسے ہی پہاڑ کی خوبصورت گھاٹی میں تھا۔ سامنے پہاڑ تھا جو برسات میں ہرے بھرے ہو جاتے ان پر بھاپ جیسے بادل اڑتے رہتے تھے اور یہ اپنے جالی دار آنگن میں ان پہاڑوں کے آنچل میں بیٹھے چپ چاپ، اپنا کام کرتے رہتے تھے۔

مولوی عبدالحق صاحب کو اگر سب سے زیادہ کسی چیز سے پریم ہے تو کام سے، وہ کام کو ہی انسان اور کام ہی کو بھگوان سمجھتے ہیں جب ان کی اسٹینڈرڈ اردو ڈکشنری چھپ رہی تھی تو میں دیکھا کرتا تھا کہ وہ اس کے پروف، رجسٹرڈ پوسٹ سے منگوا کر خود دیکھا کرتے تھے اور انہیں واپس رجسٹرڈ پوسٹ ہی سے بھیجا کرتے تھے۔ مولوی صاحب جو بھی کام کرتے ہیں، اُسے اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے کاموں پر ان کی شخصیت کی پوری مہر لگی ہوئی ہے۔ ایسے ہی کام امر ہو جاتے ہیں! انہیں دیکھ کر بہادر شاہ ظفرؔ کا یہ شعر یاد آتا ہے:

ظفرؔ! اس عالمِ پیری میں تیرے وہ ارادے ہیں
کہ جن میں تھک کے رہ جاتی جوانوں کی جوانی ہے!

(مجلس، دکن، صفحہ ۶۹—۷۶)

پروفیسر سید احمد ندوی:

روئیدادِ حق

بی۔ اے میں مولوی صاحب کا ایک اختیاری مضمون عربی تھا پھر علی گڑھ کے عام ماحول کے خلاف آپ نہایت خاموش، تنہائی پسند اور کم آمیز تھے، کھیل کود سے اُس زمانے میں بھی واسطہ نہ تھا۔ ڈاڑھی بھی آغازِ شباب ہی کی یادگار ہے۔ یہ رنگ دیکھ کر یاروں نے نماز میں امام بنانا شروع کر دیا اور مولوی صاحب عرصہ تک یونیورسٹی کی مسجد میں نماز کی امامت کرتے رہے۔

آپ اورنگ آباد دکن میں ملازم تھے کہ ایک موقعہ پر جب انجمن ترقی اردو کو مالی پریشانی کا سامنا ہوا تو آپ گاؤں گاؤں چندہ مانگتے ہوئے جمعہ کے دن ایک چھوٹے سے گاؤں میں داخل ہوئے لوگوں نے آپ کا روشن چہرہ اور نورانی صورت دیکھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا اور آپ سے پوچھے بغیر گاؤں میں خبر کر دی کہ آج جمعہ کی نماز مولانا پڑھائیں گے۔ گاؤں کا ہر بچہ سمٹ سمٹ کر مسجد میں آگیا۔ آپ بھی لوگوں کے بڑھتے ہوئے اصرار سے مجبور ہو گئے۔ بے تملق سے خطبہ دیا اور بڑے رقّت انگیز انداز میں امامت کی خدمت انجام دی، پھر کیا تھا ہن برسنے لگا اور کیسۂ زر نذرانے میں آیا لوگوں نے قدم چومے، ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ مصافحہ کر کے سینے پر ہاتھ رکھ کر رخصت کیا۔ مولانا نماز کی اس برکت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کرتے کہ تم دینیات کے لکچرار ہو جب نماز کی برکت بیان کرنے لگو تو اس واقعہ کا بھی اضافہ کر لینا جہاں محض چند روپوں کی توقع تھی وہاں نماز کی بدولت کیسۂ زر ملا۔

یہ مضمون اس ادّعا کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ "میں مولانا کو چھتیس ۳۶ سال سے بالکل قریب سے دیکھ رہا ہوں، آپ کی ایک ایک ادا، حرکات وسکنات میری آنکھوں میں ہیں آپ کی ایک ایک خصوصیت کو عنوان بنا کر دو دو سطریں بھی لکھی جائیں تو ایک ضخیم کتاب سامنے آجائے" مگر چونکہ اس قدر طوالت کی گنجائش نہیں تھی اس لیے مضمون نگار نے "جستہ جستہ حالات سپردِ قلم" فرمانے پر اکتفا کیا ہے۔

اورنگ آباد میں مولانا نے پریس قائم کرنا چاہا تو عین وقت پر جب رقم کی کوئی سبیل نہ ہو سکی تو اپنا پورا اثاثہ تین ۳ ہزار روپے صرف فرما دیا۔ صرف چند روپے تحویل میں رہ گئے جن سے ختم ماہ تک کے اخراجات کی بجاآوری ناممکن تھی آپ نے اپنے داروغۂ مطبخ مسٹر عبدالرحیم فینسی سے کہہ دیا کہ جو کچھ پیسے بچ رہے ہیں اسی میں مہینہ چلاؤ صرف چٹنی روٹی کا انتظام کرو خبردار کسی سے ایک پیسہ قرض نہ لو فینسی صاحب نے ہزار کہا کہ میرے پاس کچھ پیسے ہیں ان میں سے خورد و نوش کا معمولی انتظام کر دیتا ہوں مگر مولانا نے فرمایا نہیں، میرے پیسوں سے میرے لیے چٹنی روٹی کا انتظام کرو دس بارہ دن مہینے کے باقی رہ گئے ہیں، گزر جائیں گے، پھر تو تنخواہ مل ہی جائے گی جو چاہنا انتظام کر لینا۔ اس خدا کے مرد نے آخر چٹنی روٹی پر گزارہ کیا اور آزوقۂ حیات پر انجمن کو ترجیح دی۔

انجمن جب دکن سے دہلی منتقل ہوئی تو مولانا نے یہاں اردو کالج کی بنیاد ڈالی اور انجمن کے مکان کی تعمیر شروع کردی اور اس وقت عمر بھر کی کمائی پچاس ہزار روپے بخوشی تعمیر کی مد میں دے دی اور خود مفلس ہو کر بیٹھ گئے۔

کراچی میں بھی مولانا اپنے وظیفے کے پانچ سو روپے میں سے چار سو روپے انجمن میں جھونکتے رہے۔ حاجت روائی اور پا بجائی فرما کر بڑے مسرور ہوتے۔

اورنگ آباد کالج کے سربلند اور مایۂ ناز طالب علم شیخ چاند مرحوم جب میٹرک میں پڑھتے تھے اور بورڈنگ میں مقیم تھے تو ایک مضمون بغرض اصلاح لے کر آئے۔ میں مسکرا دیا اور ایک دوسرا مضمون دے کر مضمون لکھنے کی فرمائش کی دوسرے ہی دن وہ بھی لکھ لائے اب تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جو شخص بولنا بھی نہیں جانتا وہ اس جوہر گراں مایہ کا مالک ہے میں نے مولانا سے کہا کہ "شیخ چاند تو گدڑی میں لعل نکلا، ملاحظہ ہو اس کی تحریر" مولانا نے اسی وقت جالنہ کے ایک بڑے مخیر پارسی تاجر میزن جی کو سفارشی رقعہ لکھ دیا، جہاں سے ان کو اٹھائیس روپیہ ماہانہ وظیفہ ملنے لگا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد سودا پر وہ ریسرچ کیا جس کو تمام علمی اور ادبی بزرگوں نے بہ نظر تحسین دیکھا۔

اسی طرح سکندر علی وجد صاحب جو اس وقت حیدرآباد کی جج کے لیے باعثِ افتخار ہیں ان کی ذہانت و فطانت دیکھ کر مولانا نے بڑی تگ و دو اور اپنے پاس سے روپے خرچ کر کے ایچ۔ سی۔ ایس کے امتحان میں شریک کرایا "جل ترنگ" انہیں کا دیوان ہے اور غارہائے ایلورہ پر ان کی بلند پایہ پر شکوہ نظمیں ایک بڑی عمر یادگار ہیں۔

اردو زبان کی اشاعت کے سلسلے میں مولوی صاحب کی خدمات بڑی گراں قدر ہیں انہوں نے انتھک کوششوں، جوانی کی قیامت خیز روح اور زندگی کا سارا سکون قربان کر کے اردو کو معراجِ کمال پر پہنچانے میں کامیابی حاصل کی اور بیرونِ ملک لسانی رابطہ قائم کر کے اردو کو سرحدِ برعظیم سے آگے بڑھا کر ایران، عراق، روس، ترکی وغیرہ کی درسگاہوں میں پہنچا دیا۔

(نورس، کراچی، صفحہ ۴۶ — ۵۹)

محمود علی خاں جامعی

بابائے اردو کی بذلہ سنجی

جو شخص زندگی کے روشن پہلو سے جتنی دلچسپی لیتا ہے اتنا ہی وہ عظیم انسان ہوتا ہے مولوی صاحب میں زندگی کے خوشگوار پہلو سے جتنا شغف ہے اور خود ان کی زندگی میں یہ چیز جتنی رچی ہوئی ہے، اس سے اُن کے عظیم انسان ہونے میں کوئی کلام نہیں رہتا۔ مولوی صاحب کے پاس دوسروں کے لیے ہمیشہ بزرگانہ نصیحتیں نہیں بلکہ بیشتر ہم عمروں کی سطح سے وہ ایسے لطیف پیرایہ میں ظرافت کے ایسے جملے کہہ جاتے ہیں جو بھرپور طنز کے حامل ہوتے ہیں۔

مولوی صاحب لباس میں سادگی کے پیرو لیکن انتہائی نفاست پسند ہیں۔ اس سلسلے میں وہ کسی بے توجہی کو معاف نہیں کرتے۔ مولوی صاحب کی سرکردگی میں یوپی کے وزیر تعلیم سے ایک وفد نے ملاقات کی وہ صاحب عجیب سیلے میں تھے بالکل سیاہ بدن پر صرف ایک دھوتی، آدھی باندھے ہوئے آدھی اوپر لپیٹے ہوئے گلے میں جنیو، پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں منہ میں دتون، ماتھے پر بڑا سا تلک، مولوی صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا "یہ وزیر ہے یا 'سپیرا'" ساتھیوں کی ہنسی اور وزیر صاحب کی کھڑاؤں کی کھٹ پٹ میں مولوی صاحب کا یہ فقرہ گم ہو گیا خیریت ہو گئی لیکن مولوی صاحب کا موڈ خراب ہو گیا اور بمشکل وفد کی ملاقات میدانِ کارزار میں تبدیل ہوتے ہوتے بچی۔

کھانے کے معاملے میں مولوی صاحب بے حد خوش مذاق ہیں۔ مشرقی آداب کو پسند کرتے ہیں اور زیادہ خوری یا بدتمیزی کسی حال میں گوارا نہیں کرتے ڈاکٹر انصاری کے بھتیجے کی دعوتِ ولیمہ کے موقع پر کھانے کے دوران ایک صاحب نے نلی کی ہڈی پہلے تو منہ سے لگا کر گودا اسٹر کنے کی کوشش کی۔ جب کچھ کامیابی نہ ہوئی تو سامنے چینی کی پلیٹ رکھی تھی اسی پر کھٹا کھٹ گودا جھاڑنے لگے۔ مولوی صاحب سے ضبط نہ ہو سکا۔ بیرے کو اشارہ کر کے بہت سی خالی پلیٹیں منگوا کر ان کے سامنے رکھوا دیں

اور کہا "صاحب آپ کی مشق ستم اگر جاری رہی تو انشاءاللہ ان سب کی ضرورت پڑے گی، اس لیے آپ انہیں اپنے سامنے رہنے دیجئے۔" اُن صاحب نے خفیف ہو کر پلیٹیں ایک طرف کھسکا دیں۔

ایک صاحب ایک مرتبہ کھانے کے بعد انگلیوں سے شغل فرمانے لگے ایک اور صاحب نے ہڈی چچوڑنا شروع کی۔ مولوی صاحب سے نہ رہا گیا بولے۔ "انسان ابھی تک حیوان ہے اور طرح طرح سے حیوانی خصوصیات کا مظاہرہ کرتا ہے۔" سمجھنے والے سمجھ گئے کہ روئے سخن ان حضرت کی طرف ہے جو ہڈی سے شغل فرما رہے ہیں اور انگلیاں چاٹ رہے ہیں۔

(الشجاع، کراچی، صفحہ ۱۰۳ - ۱۰۵)

مولوی سیّد غلام ربّانی :

عظیم انسان

ایک شخصی، تاثراتی مضمون ہے، جس میں مضمون نگار نے مولوی صاحب کی عالی ظرفی ــــــــــ ان کے مشاغل اور زندگی سے اُن کی دلچسپی کا صاف ستھرے انداز میں ذکر کیا ہے۔

بچوں کی پرورش دودھ سے ہوتی ہے۔ بابا نے انجمن کو اپنا خون پلایا ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے بعد، محکمہ تعلیمات نے آپ سے میٹرک تک کی جماعتوں کے لیے اُردو ریڈریں تیار کرانے کا معاملہ کیا۔ آپ نے بڑی محنت سے دس جماعتوں کے لیے "درسیہ عثمانیہ" کے نام سے ریڈریں تیار کیں۔ ان کے علاوہ آپ کی قواعد اُردو بھی میٹرک کے نصاب میں شامل تھی۔ یہ گیارہ کتابیں بیس ۲۰ پچیس ۲۵ برس، ریاست کے تمام مدرسوں میں رائج رہیں جن کی فروخت کی آمدنی دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ یہ سالانہ آمدنی انجمن کے حساب میں جمع ہوتی رہی۔ آپ نے اس میں کبھی ایک پیسہ نہیں لیا۔ آپ نے ملک کے کونے کونے میں اردو کا وعظ کیا۔ ایک بار صرف پچیس ۲۵ سال کی رپورٹوں سے حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ آپ کے سفر کی لمبائی تین لاکھ میل کے لگ بھگ تھی۔ سفر آپ

اعلیٰ درجے میں کرنے اور آپ کا ملازم شیر دہمیشہ ساتھ رہتا لیکن آپ نے سفر کے اخراجات کی ایک پائی بھی انجمن سے نہیں لی۔

اورنگ آباد کو آپ کی ذات سے خاص نسبت ہے۔ یہ شہر مناظرِ قدرت کے علاوہ بہ لحاظِ تعمیر اپنے زمانے میں الف لیلیٰ کا بغداد تھا اور یہاں کا سب سے خوبصورت مقام اور حسین عمارت مقبرہ رابعہ دورانی ہے جو دکن کا تاج کہلاتا ہے۔ اس چار دیواری سے متصل آپ کا اور انجمن کا مسکن تھا۔ بنگلے کی شمالی پہاڑیوں میں بُدھ مت کے قدیم غار اور مغرب میں دولت آباد کا قلعہ دکھائی دیتا ہے، برابر میں مقبرہ ہے — یہاں آپ تنہا نہیں تھے۔ قدرت نے کہانیوں کی ایک کتاب آپ کے سامنے کھول رکھی تھی۔ علی الصبح نہانا، آپ کی عادتِ ثانیہ بن گئی ہے کیسی ہی سخت سردی ہو بے تکلف ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہیں۔ دوروں کے دوران اگر آپ کا کیمپ گوداوری کے کنارے ہوتا تو نظر بچا کر اس میں اشنان ہو جاتا تھا۔ صبح شام کی چہل پہل آپ کا معمول رہا ہے۔ آپ کے خیال میں سڑکوں پر ٹہلنا کوئی ٹہلنا نہیں ایسی زمین پر چلنا چاہیئے جہاں درخت ہوں، جگہ جگہ ٹیلے یا گڑھے ہوں، جھاڑ جھنکاڑ ہوں چنانچہ اکثر پہاڑیوں کے دامن میں یا چٹانوں پر گھوما کرتے تھے۔ صبح کو اپنے کمرے میں یا شام کو کسی چٹان پر یوگا ابھیاس بھی کرتے تھے جس میں ہاتھ پاؤں کی مختلف حرکتیں ہوتی تھیں جسم کو روڑ کر دوہرا کرنا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر آہستہ آہستہ پاؤں تک لے جانا اور اسی قسم کی مشقیں شامل تھیں۔

شکار کا شوق بھی رہا ہے۔ نشانہ اچھا تھا، مُرغابی کے لیے بڑے اچھے نشانے کی ضرورت ہے۔ آپ اکثر اس کا شکار کرتے تھے۔ بڑے شکار کے لیے خاص اہتمام ہوتا تھا اور شکاریوں کی طرح باقاعدہ بیل گاڑی میں بیٹھ کر جاتے تھے۔

مدتوں دکن میں رہے مگر باورچی دلی کا ہی رکھا۔ آپ کا دسترخوان بڑا پُر تکلف ہوتا جب تک کوئی مہمان یا دو چار آدمی دسترخوان پر نہ ہوں آپ کو کھانے میں مزہ نہیں آتا تھا۔ خود کم کھاتے تھے دوسروں کو کھاتا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ دسترخوان پر میٹھا ضرور ہوتا مگر اسے شاید سونگھتے ہی ہوں گے۔ کھانے کے بعد پھل استعمال کرتے اور دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر قیلولہ کرتے۔ کتاب ہاتھ میں ہوتی

اور سوچا کرتے ۔۔۔ ! کھانے کے بعد اور کام کرتے وقت پر حقہ پیتے اور تمباکو کا خاص اہتمام کرتے باغبانی سے آپ کو بہت دلچسپی ہے ۔شاید گلاب آپ کو بہت پسند ہے آپ کے چمن میں گلاب کی بہت قسمیں تھیں ۔

مولوی صاحب خوش اخلاق اور بہت ملنسار ہیں ۔سب سے خندہ پیشانی سے ملتے ۔خود کم بولتے ہیں لیکن جب بولتے ہیں تو آپ کی بات کوئی حکیمانہ نکتہ ہوتی ہے یا پھر کوئی لطیفہ ! مولوی صاحب ماتحتوں سے بے تکلف ہو جاتے اور ان کے حقوق کے لیے حکام صدر سے جھگڑا بھی مول لے لیتے تھے ۔مدرس کی بڑی عزت اور ہمت افزائی کرتے ۔

آپ سے دوسروں کی توہین نہیں دیکھی جاتی ، اخلاقی جرأت میں آپ ہمیشہ پورے اُترے اور نتیجۃً مخالفتیں بھی ہوئیں اور قدر افزائیاں بھی ! مولوی صاحب کسی سے اپنی پریشانی یا تکلیف بیان نہیں کرتے شاید تکلیف ظاہر کرنے کو اپنی شکست سمجھتے ہیں ۔

جو لوگ نیکی کرتے ہیں اور اپنی زندگی دوسروں کی بھلائی میں گزارتے ہیں وہ انسان کی شکل میں خدا کی رحمت ہوتے ہیں ۔بہت مبارک ہے وہ قوم جس میں ایسی برگزیدہ ہستیاں موجود ہوں ۔جناب مولوی صاحب بھی ایسے ہی انسان ہیں ۔

(مجلس ، دکن ، صفحہ ۱۶ ۔۔۔ ۲۵)

معین رزاق گوہر بخاری :

شمعِ انجمن

اورنگ آباد کو دو دیوانوں نے چاہا ، ایک اورنگ زیب عالمگیر اور دوسرے مولوی عبدالحق ۔ دونوں اپنی دھن کے پکے اور چاہت کے پورے تھے ۔ اورنگ زیب نے یہیں بیٹھ کر مسلسل بیس سال تک

سرکش اور شورہ پشت مرہٹوں کو کنوئیں جھنکوائے اور مولوی عبدالحق نے اسی اورنگ آباد کی سرزمین پر انجمن ترقی اُردو کو لکڑی کے ایک ٹوٹے رسن بستہ صندوق سے نکال کر ملک کا سب سے بڑا ادبی اور تہذیبی ادارہ بنادیا۔ مولوی صاحب کا اس شہر سے تعلق ۱۹۱۱ء کے اختتام سے لے کر ۱۹۲۸ء تک کسی نہ کسی طور رہا۔" مضمون میں اورنگ آباد شہر کا تعارف، برعظیم میں اس کی نادر خوبصورتی اور مولوی صاحب کی اس شہر سے وابستگی کا ذکر کیا گیا ہے۔ (نورس، کراچی، صفحہ ۱۰۵—۱۱۲)

پروفیسر ای۔ای اسپیٹ :

ترجمہ : سید ہاج الدین

لحیتہ طیب

شعبۂ انگریزی جامعہ عثمانیہ کے استاد ای۔ای اسپیٹ کا لکھا ہوا انگریزی زبان میں یہ مضمون "نورس اورنگ آباد" کے عبدالحق نمبر میں صفحہ ۸ تا ۱۴ پر درج ہے ساتھ ہی صفحہ ۱۵ —۲۶ اس کا ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے۔ یہی ترجمہ رسالہ "جوہر" کے عبدالحق نمبر میں نقل کیا گیا ہے۔

مضمون نگار نے مضمون کے عنوان کی صراحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ "لحیتہ طیب" ایک بدوی محاورہ ہے۔ جب بدوی کسی کی نیک نیتی اور دیانت کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں: "لحیتہ طیب" یعنی اس کی :

"ڈاڑھی خوب ہے!"

یہ مضمون لطیف ظرافت ہی کا اچھا نمونہ نہیں، مولوی صاحب کی سیرت کا بڑا اچھا خاکہ بھی ہے۔

(نورس، اورنگ آباد، صفحہ ۱۵-۲۶، جوہر، صفحہ ۲۴-۴۰)

صدق جائسی :

مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق کی نوّے سالہ جوبلی کے لیے لکھے گئے اس مختصر مضمون میں نواب ہوش یار جنگ مرحوم کے لفظوں میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے جو مولوی صاحب سے ایک وحشی درندے (چیتے) کی محبت و عقیدت کی خبر دیتا ہے۔ مولوی صاحب نرے زاہد خشک نہیں بلکہ بڑے دل چسپ اور زندہ دل بزرگ ہیں۔ اُن کے دو ایک مزید لطیفے بھی بیان کیے ہیں۔ (نورس، کراچی، صفحہ ۵۵ — ۵۹)

حکیم اسرار احمد کریوی :

بیوقوفوں سے بچو

مثنوی مولانا روم سے ماخوذ ایک قصہ مولوی عبدالحق صاحب کی زبان میں بیان کرنے کے بعد، حکیم صاحب نے ۱۹۳۶ء کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی صاحب حماقت کو خدا کا لاعلاج عذاب اور "مرنجان مرنج قسم کے نیک" لوگوں کو کارِ بارِ حیات کی شگفتگی و تازگی کے لیے مسرت رساں خیال کرتے تھے۔ (نورس، کراچی، صفحہ ۳۲ — ۳۴)

ڈاکٹر محمد داؤد رھبر :

بابائے اردو سے ایک حقیر کی ارادت

مضمون نگار نے مولوی عبدالحق سے اپنی ارادت و عقیدت کا اظہار کیا ہے جس سے مولوی صاحب

کے کردار کی "طفلانہ معصومیت" اور پسند و ناپسند پر روشنی پڑتی ہے۔

پھلوں سے مولوی صاحب کی رغبت مولوی صاحب ہی کے مخصوص انداز میں سننے کے لائق ہے؛ مولوی صاحب اور ڈاکٹر رہبر کوئٹہ میں ایک جگہ مہمان ہیں شام کے کھانے کے بعد میزبان کی طرف سے مولوی صاحب کے لیے دودھ بھیجا گیا کہ نوشِ جان فرمالیں تو مولوی صاحب فرماتے ہیں۔

"دودھ پینے سے دماغ بالکل بچوں کا سا ہو جاتا ہے۔ دودھ ہرگز بڑوں کے پینے کی چیز نہیں۔ گوشت بھی انسانوں کے لیے ٹھیک نہیں، اس سے درندگی آتی ہے اور ترکاری سے انسان مویشی ہو جاتا ہے پھل اصل چیز ہے، صرف پھل کھانا چاہیے۔" (الشجاع، کراچی، صفحہ ۷۰-۴)

ارشد تھانوی:

اُردو کا محسنِ اعظم

مولوی صاحب بے تکلف دوستوں میں باغ و بہار بن جاتے ہیں ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے میں حیدرآباد میں نواب اکبر یار جنگ کا مہمان تھا، وہ مولوی عبدالحق صاحب کے دوستوں میں سے تھے ایک روز مولوی صاحب تشریف لائے تو اکبر یار جنگ خانہ باغ کے چبوترہ پر عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ اکبر یار جنگ نے نماز و تسبیح سے فراغت پا کر جو دعا مانگنی شروع کی تو کئی منٹ لگا دیئے مولوی صاحب نے یہ دیکھ کر کہا چار رکعت نماز کی اتنی زیادہ قیمت طلب نہ کرو۔ مولوی صاحب بہت وسیع النظر ہیں اور ان کی زندگی کا ہر پہلو انسانیت کا بہترین نمونہ ہے۔

(نورس، کراچی، صفحہ ۱۱۳---۱۱۴)

ارشد تھانوی :

عظیم انسان

مولوی صاحب سے اپنی تین ملاقاتوں کا احوال تحریر کیا ہے جو طویل وقفوں سے (بالترتیب ۱۹۱۳ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۵۱ء میں) ہوئیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مولوی صاحب سیرت و کردار کے لحاظ سے بڑے سے بڑے آدمی سے بھی بڑے اور حقیقی معنوں میں عظیم انسان ہیں۔ (الشجاع، کراچی، صفحہ ۵۸-۶۰)

محمد احمد سبزواری :

ایم۔ اے (عثمانیہ)

مولوی صاحب

مضمون نگار نے مولوی صاحب سے اپنی واقفیت اور ۴۳ء سے ۴۵ء تک مختلف حیثیتوں میں مولوی صاحب سے تعلق کی نوعیت کا اظہار کیا ہے۔ (۴۳ء کے بعد کبھی اورنگ آباد کالج ہوسٹل کے طالب علموں نے مولوی صاحب کو کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے بعد تقریریں ہوئیں غالباً سب سے پہلے اسی موقع پر ایک طالب علم نے مولوی صاحب کو "بابائے اردو" کے لقب سے مخاطب کیا، لوگ چیخ پڑے اور فرط مسرت اور جوش میں زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔

کتاب میں مولوی صاحب دو باتوں پر ہمیشہ زور دیتے ہیں ایک یہ کہ جو کچھ پڑھا جائے ویسا ہی لکھا جائے، مثلاً: ہندستان (ہندوستان)، علاحدہ (علیحدہ) مسالہ (مسالحہ)، دوسرے مولوی صاحب کو دو لفظوں کو ملا کر لکھنے سے بہت چڑ ہے مثلاً: روشنضمیر (روشن ضمیر) کانپور (کان پور)

مولوی صاحب جامعہ عثمانیہ کے موسسین میں سے تھے مگر کہا جاتا ہے کہ جب مولوی صاحب کو یونیورسٹی میں شعبہ اردو کی صدارت پیش کی گئی تو کہا گیا کہ آپ بھی لندن جا کر ڈاکٹریٹ کریں، یہ وہ زمانہ

تھا، جب جامعہ عثمانیہ میں تقریباً تمام شعبوں کے صدر یا تو ڈاکٹر تھے یا بیرونی ڈگریاں رکھتے تھے، صرف مولوی صاحب ہی خالی بی۔اے تھے۔ مولوی صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ مَیں اس حماقت میں پڑنا نہیں چاہتا۔ غیر ملکی مستشرقین اُردو کیا جانیں۔ ابھی وہ یہاں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اکیڈمک کونسل کو اپنی سی منہ کی کھا کر چُپ ہو جانا پڑا۔

مولوی صاحب دو باتوں پر بڑا زور دیا کرتے تھے۔ ایک سادگی اور دوسرے اپنی تندرستی کا خیال۔ مولوی صاحب کو اپنے جن چند شاگردوں پر ناز ہے اُن میں شیخ چاند مرحوم بھی شامل ہیں۔ شیخ چاند کو چاند بنانے والے مولوی صاحب ہی تھے۔ اُنھوں نے اُردو میں ایم۔اے کیا، کچھ دن ریسرچ کی، پھر جامعہ عثمانیہ میں اُردو کے لیکچرار ہو گئے۔ اُن کا اوائل جوانی ہی میں انتقال ہو گیا۔ یونیورسٹی میں اُن کا تعزیتی جلسہ ہوا، مولوی صاحب نے بھی تقریر کی جس میں مرحوم کی علمی اور ادبی لیاقت کی تعریف کی اور کہا کہ سودا پر اُن کا مقالہ اِس پائے کا ہے کہ اس پر کسی بھی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ مل سکتی ہے۔ مگر جس بات پر سب سے زیادہ اظہارِ افسوس کیا وہ، یہ واقعہ تھا کہ مرحوم نے اپنی تندرستی کا کبھی لحاظ نہیں رکھا اور آخر کار اس لاپروائی کا شکار ہو گئے۔ (الشجاع، کراچی، صفحہ ۷۹—۸۴)

شرف وافتخار

مولوی صاحب کے ادبی عطیات	مولانا سید ہاشمی فرید آبادی
مولانا عبدالحق اور دکھنیات	نصیر الدین ہاشمی
اُردوئے قدیم اور بابائے اُردو	خواجہ حمید الدین شاہد
عبدالحق کے علمی کارنامے	رفیق الدین احمد
عبدالحق کے تحقیقی کارنامے	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ
اردو تہذیب و تعمیر میں عبدالحق کا حصّہ	ڈاکٹر رحیم الدین کمال

مولانا سیّد ہاشمی فرید آبادی :

مولوی عبدالحق کے ادبی عطیات و طیّبات

مضمون میں بالاختصار اُن "جواہر و نوادر" پر نظر ڈالی گئی ہے جن سے مولوی عبدالحق صاحب کی مشاطۂ طبع نے عروسِ ادب کو آراستہ فرمایا :

(۱)

زمانہ طالب علمی کے بعض قطعاتِ نظم و نثر سے قطع نظر، مولوی صاحب کی جولانیٔ قلم کا آغاز دکن حیدر آباد میں ہوا۔ ۱۸۹۶ء میں خود بھی ایک ماہنامہ "افسر" جاری کیا تھا مُعلّمی کی ضروریات نے اُردو کی "صرف و نحو" لکھنے پر توجہ دلائی۔ اسے بالکل جدید بلکہ مجتہدانہ طرز اور وسیع پیمانے پر مرتب کیا پھر بھی مطمئن نہ تھے۔ اور مدرسہ چھوڑ کر مترجمی کی خدمت پر آنے کے بعد، وہ مسودہ الماری میں ڈال دیا تھا۔ ایک دوست اسے اُڑا کر لے گئے اور اپنے "مطبع" "الناظر"، لکھنؤ میں چھاپ کر شائع کر دیا۔ ابھی تک اس موضوع پر وہ سب سے جامع اور مستند کتاب مانی جاتی ہے۔

(۲)

"عالم الاسلامی" پر ایک مبسوط مقالہ "دکن ریویو" میں کوئی تین سو صفحات کا شائع ہوا[1] جو مسلم ممالک و اقوام کے متعلق تازہ معلومات کا خزانہ تھا۔ انگریزی میں بھی اس موضوع پر ایسی اچھی کتاب چند سال بعد چھپی (اسٹوڈرٹ کی ورلڈ آف اسلام)

---

[1] اس مقالے کے درج ذیل اجزا راقم السطور کی نظر سے گزرے ہیں :

(i) العالم الاسلامی قسط ۵ ، دکن ریویو ، اپریل ۱۹۰۸ء ، ص ۲۱۳ — ۲۲۸

(ii) العالم الاسلامی قسط ۶ ، دکن ریویو ، جون ۱۹۰۸ء ، ص ۲۲۹ — ۲۴۰

(iii) العالم الاسلامی قسط ۷ ، دکن ریویو ، ستمبر ۱۹۰۸ء ص ۲۴۱ — ۲۴۸

نیز دیکھیے دکن ریویو ، مئی ۱۹۰۹ء کا اداریہ بسلسلہ "العالم الاسلامی"

(۳)

مولوی عبدالحق نے مختلف کتابوں پر اعلیٰ درجے کے علمی مقدمات لکھے جنہیں ایک حق شناس نے "مقدماتِ عبدالحق" کے نام سے شائع کیا اور صدر الصدور شروانی مرحوم کی ادبی عدالت سے فاضل مُصنّف کو "مقدمہ باز" کا خطاب دلوایا۔

(۴)

مولوی چراغ علی کے تحقیقی مقالوں کا نام صرف مولوی عبدالحق کے اُردو ترجموں کی بدولت سامنے رہا یعنی: (۱) اعظم الکلام فی ارتقار الاسلام (۲) تحقیق الجہاد

(۵)

اورنگ آباد میں منتقلی اور انجمن کے سکریٹری منتخب ہونے کے بعد مولوی عبدالحق نے قدیم دکنی مخطوطات کی تلاش پر خاص توجہ بلکہ مشقت مبذول کی بے پایاں شوقِ جُستجو ہی سے اِن "دفینوں" تک رسائی ہو سکتی تھی مگر انھیں کھود نکالنے سے بھی دشوار مرحلہ ان کی نیم مردہ زبان کے معنی نکالنا تھا۔ نصرتی، وجہی قلی قطب شاہ جیسے کتنے ہی ادبی کواکب گہنائے پڑے تھے، مولوی صاحب کی تحقیق و ترصّد نے ان کے نام اور کلام کو دوبارہ چمکایا۔ زبان کی عمر کئی صدی بڑھادی۔ عہدِ مُغل سے کہیں پہلے اسے بولتے گیت گاتے سُنادیا۔

(۶)

دکنیات کے احیا کی طرح شعرائے اُردو کے بھولے بسرے تذکروں کی اشاعت ہماری زبان پر مولوی عبدالحق کا ایک اور عظیم احسان ہے جو کبھی فراموش نہ ہو گا۔ یہ قلمی ستون بہت کمیاب اور بعض بالکل بے نشان ہو گئے تھے۔ اِنہی میں میرتقی میر کی خود نوشت سوانح "ذکرِ میر" کا اکتشاف سرِفہرست ہے۔ پھر میر، گردیزی، ابراہیم، شفیق، مصحفی، میرحسن وغیرہ کے تذکروں کو نسیان کے طاقوں سے اُتارنا اور ناقدانہ تصحیح کے ساتھ اہلِ شوق کے ہاتھوں تک پہنچانا زبان پروری کا یادگار کارنامہ ہے۔ اس سلسلے کی دو نہایت مفید کتابیں "تذکرہ گلشن ہند" اور "مآثر الکرام" بھی مولوی عبدالحق کی ناقدانہ تصحیح اور ترجمے سے طبع ہوئیں۔

(۷)

انجمن کی انگریزی اردو ڈکشنری کی تیاری میں متعدد اہلِ علم شریک تھے مگر منصوبے کی ابتدا سے تصحیح طباعت کی انتہا تک مدیرِ اعلیٰ کی عرق ریزی شاملِ حال رہی، ورنہ یہ دشوار شاندار کام کبھی تکمیل نہ پاتا۔ اسی عنوان کے تحت جدید لغتِ اردو کا منصوبۂ جلیل اٹھا ہے جسے بیس پچیس برس کی محنت بھی تکمیل کے قریب نہ لا سکی۔ صرف حرف "الف" کے تقریباً دو سو صفحے حیدرآباد کے سرکاری مطبع میں چھپے اور ابھی زیرِ تصحیح تھے کہ آزادیٔ ہند کی آندھیوں نے وہ کارخانہ زیر و زبر کر دیا۔

(۸)

جدید علوم اور پیشہ وروں کی اصطلاحات کے مجلدات سب مولوی صاحب کی تحریک و سعی کے منت گزار ہیں۔ اس لائقِ سپاس کوشش و کاوش کا سلسلہ دکن، دہلی، پاکستان کہیں منقطع نہیں ہوا۔ اسی موضوع پر کراچی سے مولوی صاحب کے چند رسالے شائع ہوئے ہیں جو اُن کی عالمانہ بصیرت اور دیرینہ مہارت کے علاوہ اصطلاح سازی کے اصول و رموز کے ہدایت نامے ہیں۔

جناب مولوی صاحب کے بیان کی قوت و تاثیر کا نقطۂ شرف بعض اہلِ نظر، اُن کے تحریری خطبات کو قرار دیتے ہیں جو رسمی خطابت کی صناعی اور طوالت سے بری ہونے کے باوصف لسانی معلومات سے لبریز ہیں۔ قلم کی روانی کا ایک اور کرشمہ ممدوح کی خط نویسی میں نظر آتا ہے۔ گزشتہ تقریباً نصف صدی میں اُن کا روزانہ اوسط آٹھ دس خطوں سے کم نہ نکلے گا۔ اکثر کافی طویل اور عموماً سبھی دلچسپ و پُر معنی ہیں۔ شمس العلماء ذکاء اللہ مرحوم پُر نویسی میں مشہور تھے اور فخریہ کہتے تھے کہ میرے قلم نے سترہ برس کی عمر سے ستّر کے سن تک تین صفحے کا روزانہ سر دیا ہے، مولوی عبدالحق صاحب کے دوسرے مقالات و مضامین کا ذکر نہیں صرف خطوط جمع کیے جائیں تو مرحوم کے سارے طومار سے بھاری پڑیں گے۔ ان مکاتیب میں سے معدودے چند مختلف رسائل میں چھپے ہیں لیکن اب اہلِ ذوق اس فکر میں ہیں کہ دو تین مستقل جلدوں میں "انشائے عبدالحق" مدوّن کر دی جائے۔ (الشجاع، کراچی، صفحہ ۳۸ — ۴۰)

نصیرالدین ہاشمی:

ڈاکٹر مولانا عبدالحق اور دکھنیات

مولانا ڈاکٹر عبدالحق دکھنیات کے پہلے معمار ہیں اور دکھنی ادب سے اصحابِ علم کو روشناس کرانے کا سہرا اُن کے سر ہے۔ انھوں نے انجمن کی جانب سے دکھنیات پر جو کام فرمایا ہے، اُس کو ان چند اقسام پر تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ دکھنی شعرا کے تذکرے ایڈٹ کر کے شائع کرنا۔

۲۔ دکھنی نظم اور نثر کو ایڈٹ کر کے شائع کرنا۔

۳۔ دکھنیات پر تنقیدی کتابیں تصنیف کرنا۔

۴۔ دکھنیات پر مضامین اور مقالے مرتب کرنا۔

۵۔ دکھنی نظم اور نثر کی قلمی کتابوں کا فراہم کرنا۔

مولوی صاحب کے مرتبہ دکھنی تذکروں میں چمنستان شعرا اور گل عجائب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں جن کی وجہ سے دکن کے بیسیوں شعرا کا حال ارباب علم کو معلوم ہوا اور دنیائے اردو کو دکھنی شعرا سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ دکھنی نظم اور نثر کی جن کتابوں کو مولوی صاحب نے ایڈٹ کیا وہ یہ ہیں:

۱۔ معراج العاشقین، خواجہ بندہ نواز رح

۲۔ سب رس، مصنفہ وجہی

۳۔ قطب مشتری مصنف وجہی

۴۔ مثنوی جنگ نامہ عالم علی خان و آصف جاہ مصنف غضنفر

۵۔ گلشن عشق، مصنف نصرتی

۶۔ علی نامہ، مصنف نصرتی

آخر الذکر دونوں کتابیں پاکستان بن جانے کے بعد شائع ہوئیں "سب رس" کو مولوی صاحب نے رسالہ اُردو بابت اکتوبر ۱۹۲۴ء کے ذریعے خصوصیت سے تفصیل کے ساتھ متعارف کرایا۔ دکھنی ادب سے متعلق جو تنقیدی کتابیں مولانا نے تالیف کر کے شائع کیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اُردو کی نشو و نما میں صوفیا کرام کا کام ۲۔ نصرتی۔

دکھنیات کے ضمن میں مولوی صاحب نے جو بلند پایہ مضامین لکھے ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ حضرت شاہ میران جی شمس العشاق ۲۔ حضرت شاہ برہان الدین جانم

۳۔ حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ ۴۔ سب رس منظوم یعنی وصال العاشقین از ذوقی اور گلشنِ حسن و دل از بحری

۵۔ حسن شوقی ۶۔ لچھمی نرائن شفیق ۷۔ مراثی غواصی ۸۔ شمع پروانہ ۹۔ غزلیات اشرف ۱۰۔ غزلیات ایجاد

۱۱۔ شیخ ملا نصرتی ۱۲۔ ولی کے سن وفات کی تحقیق ۱۳۔ حیدر آباد کا ایک شاعر خاندان ——

۱۴۔ قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں۔

یہ تمام مضامین نہایت اہم ہیں ان میں شعرا اور نثر نگاروں کے حالات بڑی جد و جہد اور کاوش کے ساتھ تحقیق کر کے جمع کیے گئے ہیں اور ان کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے جس سے اِن کے اسلوبِ بیان طرزِ ادا اور زبان کی تدریجی ترقی کا حال بخوبی واضح ہوتا ہے۔ انھوں نے دکھنی قلمی کتابوں کے جمع کرنے کا اہتمام بھی کیا، غرض وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے دکھنیات کی طرح توجہ فرمائی اور اپنی کتابوں اور مضامین سے دکھنیات کے میدان میں قابلِ قدر اور لائق ستائش اضافہ کیا۔

(مجلس، دکن، صفحہ ۱۳۴—۱۳۸)

خواجہ حمید الدّین شاہد:

مدیر لغتِ اُردو، ترقی اُردو بورڈ کراچی

اُردوئے قدیم اور بابائے اُردو

بابائے اُردو نے قدیم اُردو کے مخطوطات کی تلاش مختلف ادوار کے ادبی تذکروں اور تاریخ

کی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد ان کی ترتیب اور صحیح نتائج پر پہنچنے کے لیے چھان بین میں جس دقّتِ نظر اور علمی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے مضمون نگار نے اس مضمون میں اسی کا احاطہ کیا ہے۔

قدیم اُردو کے سلسلے میں مولوی صاحب کا پہلا مضمون، اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شاعری پر جنوری ۱۹۲۲ء میں چھپا۔ قطب شاہی دور کے سب سے بڑے ادیب اور شاعر ملا وجہی کی معروف مثنوی "قطب مشتری" (۱۶۰۹ء) کا مخطوطہ حاصل کیا اور برٹش میوزیم کے مخطوطے سے مقابلے کے بعد ۱۹۳۸ء میں انجمن کی جانب سے شائع کیا۔ مثنوی کی ابتدا میں ۴۰ صفحات کا بسیط مقدمہ لکھا اور کتاب کے آخر میں دکنی الفاظ کی ایک فرہنگ بھی دی۔

رسالہ اُردو بابت اکتوبر ۱۹۲۴ء میں بابائے اُردو نے "سب رس" پر جسے قدیم اُردو نثر کی پہلی ادبی کوشش سمجھا جاتا ہے، ۲۶ صفحات کا طویل مقدمہ تحریر کیا اس کا سنہ تصنیف (۱۰۴۵ھ) متعین کیا، موضوع اور قصے کے پلاٹ کا تفصیلی جائزہ لیا۔ ۱۹۳۲ء اور پھر ۱۹۵۲ء میں انجمن کی طرف سے اس کے کتابی ایڈیشن چھپے، کتاب کے آخر میں قدیم الفاظ کی ایک فرہنگ بھی دی گئی ہے۔

"قدیم اُردو" کے تحت بابا کے کئی مضامین سلسلہ وار چھپے اپریل ۲۴ء کے رسالہ "اردو" میں اس سلسلے کا پہلا مضمون "بیجاپور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان" شائع ہوا جس میں حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کے حالاتِ زندگی، ان کے ماحول اور تصنیفات کو روشناس کرایا گیا ہے۔ رسالہ اُردو جنوری ۲۸ء میں بیجاپور کے ایک صوفی شاعر حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ کی زندگی اور شاعری پر مولوی صاحب کا مضمون شائع ہوا۔

رسالہ اُردو اپریل ۲۸ء میں "قدیم اُردو" کے عنوان سے انھوں نے اُردو نثر کی ایک بہت قدیم کتاب "شرح تمہید ہمدانی" کا تعارف کرایا ہے۔

رسالہ اُردو بابت جولائی ۲۹ء میں "قدیم اُردو" کے عنوان سے حسن شوقی پر ۲۲ صفحات کا پرمغز مقالہ تحریر فرمایا ہے۔

قدیم اُردو کے موضوع پر بابائے اُردو کے کچھ اور مضامین کی تفصیل یہ ہے:-

۱۔شاہ علی محمد جیو گام دھنی (گجری زبان کا ایک قدیم شاعر) مطبوعہ رسالہ اُردو جولائی ۱۹۲۸ء

۲۔میاں شیخ خوب محمد چشتی (گجری زبان کا ایک قدیم شاعر) رسالہ اُردو جنوری ۱۹۲۹ء

۳۔غواصی (ملک الشعرا گولکنڈہ) اُردو، اپریل ۱۹۳۰ء

۴۔عشرتی (گولکنڈہ کا ایک قدیم شاعر) جولائی ۱۹۳۱ء

۵۔ملا نصرتی (ملک الشعرا بیجاپور) جنوری ۱۹۳۴ء

۶۔علی نامہ (ملا نصرتی کی مثنوی) اپریل ۱۹۳۴ء

۷۔تاریخ اسکندری (ملا نصرتی کی مثنوی) جولائی ۱۹۳۴ء

اُردوئے قدیم کی جو کتابیں بابا نے مرتب کر کے انجمن سے شائع کرائیں اُن کے کچھ نام یہ ہیں:

۱۔قطب مشتری ۲۔سب رس ۳۔نصرتی ۴۔گلشنِ عشق ۵۔اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام

(مجلس، دکن، صفحہ ۷۷—۸۷)

رفیق الدین احمد:

مارننگ نیوز، کراچی

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

یہ مضمون مولوی صاحب کی زندگی اور کارناموں کا مختصر خاکہ ہے مضمون نگار نے مولوی صاحب کی تاریخ اور جائے ولادت بالترتیب ۱۸۷۵ء اور موضع ہاپوڑ بتائی ہے جب کہ صحیح تاریخ ولادت ۲۰۔اگست ۱۸۷۰ء اور جائے ولادت خاص ہاپوڑ ہے۔ مضمون نگار نے ابتدا ہی میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "مولوی صاحب نے ۱۸۹۶ء میں اُردو ماہ نامہ "افسر" کرنل صاحب (افسر جنگ) کے نام پر جاری کیا تھا۔ یہ بات بھی درست نہیں اس لیے کہ رسالہ "افسر" کا اجرا نواب میجر افسر الدولہ کمانڈر امپیریل سروس ٹروپ و گولکنڈہ بریگیڈ وایڈ یکانگ والئی ریاست حیدرآباد دکن کے ایما پر اپریل ۱۸۹۷ء میں ہوا اور ابتداً اس کا سارا کاروبار

محب حسین صاحب انجام دیتے تھے۔ مولوی صاحب تو اس رسالہ سے ۹۹-۱۸۹۸ء میں کسی وقت منسلک ہوئے
مضمون نگار نے آخر میں انجمن کے اُن علمی کاموں کا جو مولوی صاحب کے زیر اوارت و ہدایت انجام پائے
مجمل نقشہ دکھایا ہے ۱۹۱۳ سے ۱۹۵۳ تک مطبوعاتِ انجمن کی تعداد ۲۶۵ تھی ان کی قسمیں یہ ہیں:

۱۔ تاریخ زبان، تذکرہ } تقریباً ۶۵
۲۔ دواوین قدیم ومنتخبات

۳۔ ادب عالیہ (جن میں الف لیلیٰ، شکنتلا، فاؤسٹ وغیرہ دیگر زبانوں کے ترجمے شامل ہیں) ۳۵

۴۔ تاریخ سیاسیات، عمرانیات (ان میں البیرونی کی کتاب الہند، تاریخ اخلاق یورپ، مشاہیر یونان و روما تاریخ ادبیاتِ ایران کے تراجم اور علم الاقوام، چین و عرب کے تعلقات، تاریخ مسلمانانِ پاک و بھارت ایسی ممتاز تالیفات شامل ہیں) ۴۵

۵۔ فلسفہ، فن تعلیم، معاشیات (افلاطون، کانٹ، نطشے کے تراجم، معاشیات، نفسیات اور تاریخ فلسفہ پر معیاری کتابیں) ۲۵

۶۔ جدید سائنس (موالید ثلاثہ طبقات الارض، نظریہ ارتقا و اضافیت) ۲۵

۷۔ لغات فرہنگ (بشمول انگریزی اردو کی بڑی لغت مصطلحات سائنس اصطلاحاتِ پیشہ وراں)[16]

۸۔ متفرقات علمی و ادبی ۵،

۹۔ سہ ماہی رسائل: اردو، سائنس، تاریخ و سیاسیات

ماہنامہ: معاشیات

نیم ماہنامہ: قومی زبان (ہماری زبان)

مضمون نگار کے اندازے کے مطابق مولوی صاحب کے خطوں کا تخمینہ ایک لاکھ سے متجاوز اور کتب و رسائل پر ان کی تنقیدات اور تبصروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے علمی کاموں کا مختصر حال یہ ہے:

۱۔ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام ― یہ دونوں مولوی چراغ علی کے فاضلانہ مقالات ہیں۔
۲۔ تحقیق الجہاد | زیادہ تر مولوی عبد الحق کے اردو ترجمے کی بدولت ہی ان کا نام باقی رہ گیا ہے۔

۳۔ قواعد اردو: جسے مولوی صاحب نے بڑی محنت اور عالمانہ بصیرت سے نئے طرز پر تالیف کیا۔ تاریخِ صرف و نحو پر ایک مقدمہ بھی شامل کتاب ہے۔ اکثر مدارس میں داخلِ نصاب ہوئی۔ ضخامت ۳۶۵ صفحات ۱۹۵۱ء میں پانچویں مرتبہ کراچی سے چھپی۔

۴۔ مقدماتِ عبدالحق: (۲ جلد) علمی و ادبی کتابوں پر مولوی صاحب کے فاضلانہ مقدمے، ایک صاحب نے ۳۵-۳۲ مقدمات کا یہ مجموعہ ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد میں طبع کرایا۔

۵۔ دکنیات اور تذکرے: یہ مولوی صاحب کا اُردو زبان پر یادگار احسان ہے جس نے اردو زبان کی عمر کئی صدی بڑھادی اور اس کی تاریخ کی صورت ہی بدل ڈالی ان مخطوطات پر مولوی صاحب کے فاضلانہ مقالات پے درپے رسالہ "اردو" میں چھپے اور بعض ان دکنی کتابوں میں شامل ہیں جنھیں مولوی صاحب نے کمال دیدہ ریزی سے تصحیح و فرہنگِ الفاظ کے ساتھ طبع کرایا۔ ایک مقالہ "اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" علاحدہ بھی کئی بار چھپا اسی ضمن میں دو طویل مقالے جو اب کتابی صورت میں ملتے ہیں اور قابلِ ذکر ہیں (۱) مرحوم دہلی کالج (۲) مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر مولوی صاحب کے تلاش کردہ شعرائے اُردو کے متعدد تذکروں اور چند قدیم دواوین پر ان کے عالمانہ مقدمات بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔[۱]

---

[۱] یہ ایزاد کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ ۱۹۶۱ء میں "قدیم اُردو" کے نام سے مولوی عبدالحق مرحوم کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ شائع کر دیا گیا ہے جس میں اردو کے اولین مصنفوں اور ان کی تصانیف کے متعلق یہ مقالات شامل ہیں:

۱۔ بیجاپور کے اولیاءاللہ کا شاعر خاندان: (الف) حضرت شاہ میران جی شمس العشاق (ب) حضرت شاہ برہان الدین جانم (ج) حضرت امین الدین اعلیٰ

۲۔ گجری اور گجراتی زبان: (الف) شاہ علی محمد جیو گام دھنی (ب) میاں شیخ خوب محمد چشتی (ج) حسن شوقی۔

۳۔ قاضی محمود دریائی حیدرآباد کا ایک شاعر خاندان: (الف) ملا خسرتی (ب) سید احمد ہنر (ج) علی احسان

۴۔ پُرانی اردو میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں

۵۔ دکنی اُردو میں شاہ نامے اور داستانیں

۶۔ اُردو زبان کا ایک قدیم کتبہ

۷۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ

۸۔ شل خاں باری

۹۔ شرح تمہیداتِ ہمدانی

۱۰۔ مثنوی وفات نامہ حضرت فاطمہؓ

۱۱۔ سب رس از مُلّا وجہی

۱۲۔ سب رس منظوم

۶۔ چند ہم عصر: یہ چوتھی بار جدید اضافوں کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور شروع سے ایک یادگار ادبی تحفہ مانی جاتی ہے۔

۷۔ خطباتِ عبدالحق: مولوی صاحب کے بیان کی قوت وتاثیر کا غالباً سب سے اچھا نمونہ یہ خطبات ہیں جو لسانی معلومات سے لبریز اور مصنوعی لفاظی سے بالکل خالی ہیں۔

۸۔ تنقیداتِ عبدالحق: مستقل حجم کی کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ نئے سینکڑوں مضامین ابھی ترتیب اور طباعت کے منتظر ہیں۔ (نورس، کراچی صفحہ ۴۴ — ۴۸، نیز صفحہ ۱۳۸ — ۱۴۱)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ:

پروفیسر و صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن

ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے

بابائے اردو کا بڑا کارنامہ اردو ادب کے اُن شعرا اور مصنفین کو زندگی عطا کرنا ہے جو معنوی طور پر مر چکے تھے، اس طرح وہ اردو کے "بابا" ہی نہیں "مسیحا" بھی ہیں۔ ان کی تحقیقات اُردو زبان کے متعلق بھی ہیں اور اُردو ادب کے تعلق سے بھی، دونوں میں ان کا طریقہ استخراجی بھی ہے ——— اور اشتقاقی بھی ——— یعنی وہ اندرونی اور بیرونی دونوں شواہد سے کام لیتے ہیں پھر لطف یہ کہ تحقیق میں "خشکی" نہیں پیدا ہونے پاتی بلکہ شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ اس لیے ان کی تحقیقات "محقق" اور "متعلم" سے قطع نظر، عام آدمی (LAYMAN) کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ ان کی مستقل تصانیف میں ذیل کے نوادر قابل قدر ہیں:

۱۔ اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام (۲) مرحوم دہلی کالج (۳) نصرتی (۴) مقدمہ قطب مشتری (۵) سب رس (۶) مقدمہ باغ و بہار (۷) مقدمہ معراج العاشقین (۸) قواعد اردو (۹) مقدمہ خطبات گارساں دتاسی (۱۰) مرہٹی کا اثر فارسی زبان پر (۱۱) مقدمہ گلشن ہند

مندرجہ بالا تصانیف کا مختصر تعارف بھی درج کیا گیا ہے۔

مولوی صاحب نہ صرف خود تحقیق کے رسیا ہیں بلکہ اپنے طالب علموں میں بھی تحقیق کی لگن لگا دیتے ہیں اس کی مثال محمد شیخ چاند مرحوم، پروفیسر عزیز احمد، ہاشمی فرید آبادی اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں ہیں۔

(مجلس، دکن، صفحہ ۱۲۰۔۱۲۴)

ڈاکٹر رحیم الدّین کمال:

اُردُو تہذیب کی تعمیر و ترقی میں مولوی صاحب کا حصّہ

مضمون نگار نے اُردو زبان کے تہذیبی پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ اس طرزِ فکر اور روشِ حیات کے بنانے اور ترقی دینے میں مولوی عبدالحق صاحب نے کیا کارنامہ انجام دیا۔ یہ مضمون اُردو مجلس حیدر آباد دکن کی طرف سے منائے گئے "یوم عبدالحق" کی تقریب میں ۲۹ مئی ۱۹۶۰ء کو پڑھا گیا۔

کالج کے زمانے میں مولوی صاحب نے فلسفہ اور تاریخ کا مطالعہ کیا تھا۔ مدرسۂ آصفیہ کی صدارت کے زمانے میں انہیں عربی، فارسی اور ہندی میں استعداد بڑھانے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ مولانا شمس الدین سے استفادہ کیا اور ایک پنڈت سے ہندی پڑھی۔ حیدر آباد کی علمی اور تہذیبی زندگی میں دیوان خانوں کی بیٹھک یا نشست نے بڑا کام کیا ہے۔ مولوی صاحب سرِ شام مدرسۂ آصفیہ کے سامنے والے چبوترے پر بیٹھ جایا کرتے، دوست احباب ملاقاتی سب جمع ہوتے، بذلہ سنجی کے دریا امنڈتے، علمی مباحث رہتے۔

اورنگ آباد کی سرزمین کا مولوی صاحب کے عزائم کو اُبھارنے میں بڑا دخل ہے۔ اردو تہذیب میں اورنگ آباد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے — سرزمینِ دکن میں آصف جاہوں کے دورِ حکومت میں جس تہذیب کو فروغ ملا اس کا خمیر دکن اور شمالی ہند کے عناصرِ ترکیبی کے خوشگوار امتزاج سے دراصل اورنگ آباد ہی میں ابھرا۔ پھر آب و ہوا کی پاکیزگی فطرت کی فراوانی، میووں کی افراط اور اس پر صاحبِ ذوق

احباب کا جھگٹا مولوی صاحب کے لیے غیر معمولی نعمت تھی۔

انجمن ترقی اردو کی معتمدی کے بعد مولوی صاحب اردو زبان میں نئے تجربوں کی صورت پیدا کرنے کی طرف مائل ہوئے اور وہ سب کچھ کیا جو جدید افکار و خیالات سے اردو زبان کے بولنے والوں کے لیے ضروری تھا انھوں نے سلسلۂ عثمانیہ کے نام سے کتب درسیہ تیار کیں جن کے ذریعے دکن اور شمالی ہند کی روایات کو مربوط کیا اور اس طرح اردو زبان کا ایک کل ہند تصور متشکل ہوا۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ ہندوستان بھر کی نئی نسل کے فکر و خیال میں ان کتابوں کے ذریعے ایک زبردست انقلاب آیا۔

مولوی صاحب نے اردو ڈکشنری کی طرف توجہ کی اور ایک معیاری لغت تیار کی۔ اس نے افکارِ جدید کے پھیلانے میں وہ کام کیا ہے جو ایک سلطنت یا بڑے ادارے سے بھی ممکن نہیں تھا۔ یہ لغت بجائے خود ایک ادارہ بن گئی۔ نتیجتہً ہر طرف مغرب کی ترقی یافتہ زبانوں کے شاہکار اردو کا جامہ پہن کر منظرِ عام پر آنے لگے اور ان ترجموں نے اردو کے اسلوبِ بیان اور منہاجِ فکر کو متاثر کیا اور اردو ادب کو نئے سانچے کے ساتھ گہرائی اور وسعت بھی بخشی — جامعہ عثمانیہ کی تحریک اور اس کے قیام میں مولوی صاحب نے گراں قدر خدمات انجام دیں اور جامعہ عثمانیہ کی وجہ سے نہ صرف اردو زبان جدید علوم و فنون سے آشنا ہوئی بلکہ نئے افکار اور نظریے پیدا ہوئے اور ایک نیا انسان عالمِ وجود میں آیا۔

(مجلس، دکن، صفحہ ۴۲—۵۲)

فکر و فن

مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری	ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری
حدیثِ دیگراں	ڈاکٹر سید عابد حسین
چند ہم عصر اور عبدالحق	خواجہ تہور حسین
مولوی عبدالحق بحیثیت خاکہ نگار	ڈاکٹر خلیق انجم
خطباتِ عبدالحق	ڈاکٹر فرمان فتحپوری
مولوی عبدالحق کا اسلوب	پروفیسر نثار احمد فاروقی
مولوی عبدالحق کا اسلوبِ بیان	ڈاکٹر ثمینہ شوکت
ڈاکٹر عبدالحق کے تنقیدی تصورات	ڈاکٹر سیدہ جعفر
تنقیدات اور مقالاتِ عبدالحق	نواب منظور یار جنگ بہادر
ترجمے کی اہمیت مولوی صاحب کی نظر میں	یونس احمر
بابائے اُردو کی ریڈیائی تقریریں	انور عنایت اللہ
مولوی عبدالحق اور انتظام	مولوی سید ساجد علی
مولوی عبدالحق اور تعلیمات	مولوی سید ساجد علی

ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری:

پروفیسر و صدر شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مولوی عبدالحق کی مرقّع نگاری

مضمون میں مُرقّع نگاری اور سوانح عمری کے مبادیات اور مُقتضیات پر بڑی جامع بحث کے بعد مولوی صاحب کی مرقع نگاری کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ :

"چند ہم عصر" اپنا الگ ایک امتیاز رکھتی ہے۔ مولوی صاحب نے اس "نگار خانے" میں جن بظاہر متخالف شخصیتوں کو جمع کر دیا ہے، اور اُن کی جن اخلاقی اور انسانی خوبیوں کو سراہا ہے، اس سے ان کے مرکزی اقدارِ حیات کے تعیّن کا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔ اِن مرقعوں میں مولوی صاحب نے اپنے ممدوحین کی جن خوبیوں پر زور دیا ہے، اُن سے ایک حد تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں کن اخلاقی قدروں کو عزیز رکھتے ہیں کہیں کہیں ایسے، جملے بھی ملتے ہیں جہاں انھوں نے بعض حالات کا ذکر، بعض شخصیتوں کی تصویر کشی یا ان حالات میں ان شخصیتوں کے ردِ عمل سے تعمیمات اخذ کیے ہیں۔ اِن عام نتائج اور مفروضوں کی صحت اور صداقت سے قطع نظر یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ وہ انسانی شخصیت کے کن پہلوؤں سے زیادہ ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔

مرقّع نگاری میں جو چیز سب سے پہلے ہماری توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہے وُہ اُن کی تحریر میں تقلیل الفاظ کا جوہر ہے ——————— اُن کے یہاں مفہوم کی اکائیوں اور الفاظ کی اکائیوں کے درمیان بے حد مطابقت پائی جاتی ہے۔ عبارت میں جھول نہیں جملوں کی درو بست اور تنظیم میں اختصار، صحت اور جامعیت سے کام لیا ہے لیکن ان میں طنز اور تنقید کا ایک ہلکا سا پہلو بھی نکلتا ہے۔ دوسری خصوصیت اِن مرقعوں کی ٹھیٹ زبان ہے۔ انھوں نے دوسری زبانوں کے الفاظ ایک خاص تناسب اور اعتدال کے ساتھ اس طرح ایک دوسرے میں آمیز کیے ہیں کہ

زبان کی اپنی انفرادیت اور حسن نکل آیا ہے۔ ان سب لوگوں نے جو اس مجموعے میں شامل ہیں مولوی صاحب کے جذبۂ تحسین کو اُکسایا ہے لیکن اُن کی رائیں، خوبیوں اور خامیوں کا غیر جانبداری کے ساتھ احاطہ کرنے کے سبب بہت متوازن ہوگئی ہیں۔ ان کا خیر وشر کا تصور عقلی ہے، جذباتی نہیں۔ وہ انتہائی ہمدردی، محبت اور عقیدت کے باوجود اپنی رائے کے منصفانہ اظہار میں پس وپیش نہیں کرتے۔ اس مجموعے کا سب سے دلچسپ مرقع حسرت موہانی کا ہے جس میں اُن کی ظاہری ہیئت، اُن کے خیالات کا تضاد اور اُن کی بے پناہ اخلاقی جرأت اور عزم وایثار اور استقلال کو بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔

مرقع نگاری کے جدید ترین فن میں مولوی عبدالحق جو امتیاز رکھتے ہیں ان میں صرف پروفیسر رشید احمد صدیقی اُن کے شریک ہیں۔ دونوں کے فن میں جو فرق ہے، وہ اُن کے مزاج اور اُن کے نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ رشید صاحب کا آرٹ حرکی اور تخیلی ہے۔ مولوی صاحب کے ہاں عقل اور قوتِ فیصلہ کی کار فرمائی زیادہ ہے۔ تقلیلِ الفاظ، محاورہ کا استعمال، عبارت کا گھٹاؤ منصفانہ محاکمہ اور سیرت نگاری میں مرکزی اخلاقی اقدار کی تلاش "چند ہم عصر" میں جگہ جگہ نظر آتی ہے ان مرقعوں کے پڑھنے سے بڑی حد تک یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سرسیّد کے دور سے لے کر اب تک مسلمانوں نے علم وفضل اور شعر وادب کے میدان میں کیا کارنامے سرانجام دیئے ہیں مبسوط سوانح عمری کے برعکس، قلمی تصویریں صرف چند نقوش کو اُبھار سکتی ہیں لیکن ذاتی تعلقات کے اس تانے بانے کے نیچے وسیع تر قومی اور تہذیبی زندگی کے دھاروں کے رُخ کو پہچانا جاسکتا ہے۔ ان مرقعوں میں کہیں کہیں طنز ومزاح کے ہلکے ہلکے چھینٹے بھی نظر آتے ہیں لیکن ان پر عقل کا زبردست پہرہ ہر جگہ بیٹھا ہوا ہے۔ کردار نگاری، سماجی پس منظر، ذاتی واقفیت معروضی انداز بیان اور زبان و بیان کی صحت اور وضاحت کی بنا پر یہ مرقعے بہت اہم اور دلکش ہیں۔

(مجلس، دکن صفحہ ۴—۱۳)

ڈاکٹر سید عابد حسین :

حدیثِ دیگراں

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا یہ مضمون بڑا گراں قدر، اہم، دلچسپ اور توجہ طلب ہے. موصوف نے "چند ہم عصر" کی روشنی میں مولوی صاحب کے رنگِ طبیعت کا اندازہ لگانے کی راہ سُجھائی ہے اور بعض اقتباسات سے "اندرونی شہادتیں" فراہم بھی کی ہیں، لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ کُل نہیں صرف چند اشارے ہیں. "نقش کے اندر سے نقاش کو ڈھونڈ نکالنے کا یہ کام" واقعی ایک مختصر مضمون میں ممکن بھی نہیں تھا. بہر حال ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون ان کی ذہانت، نُدرتِ خیال اور سوجھ بوجھ پر دلالت کرتا ہے اور حد درجہ لائقِ قدر اور قابلِ غور ہے۔

ہر شخص جو لفظ، نقش یا نغمے کے ذریعے سے حقیقت کی تصویر کھینچتا ہے یا اس کی تفسیر کرتا ہے خودی کے دونوں سروں یعنی خود نمائی اور خود پوشی کے بیچ میں جھولا کرتا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو ہر انسان جو بقدر بصیرت زندگی کا مطالعہ اور بقدر ہمت اس کی تشکیل کرتا ہے اسی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے. حیات و کائنات کا اپنی بساط کے مطابق احاطہ کرنے کے لیے ہر انسان اس پر مجبور ہے کہ اپنی ذات کو مرکز بنا کر فکر و عمل کا ایک دائرہ کھینچے. زندگی کا صحیح توازن یہ چاہتا ہے کہ مرکز اور محیط کا فرق مٹ جائے یعنی انسان کی شخصیت اس کے نصب العین اور اس کے کام میں اس طرح گھُل مِل کر ایک ہو جائے کہ دوئی کا شعور تک باقی نہ رہے لیکن یہ مقام بہت مشکل ہے اور چند خاصانِ خدا کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوتا. عام طور پر انسان کبھی مرکز کی طرف جھکتا ہے کبھی محیط کی طرف کبھی اپنی ذات کو اپنے کام سے اہم سمجھ کر اسے اُبھارنا اور چمکانا چاہتا ہے اور کبھی اسے محض حصولِ مقصد کی ایک قوت جان کر اپنے کام میں کھپا دینے کی کوشش کرتا ہے اس کی خود نمائی کی انتہا یہ ہے کہ زندگی کی ساری صرف و نحو واحد متکلم

کا صیغہ بن کر رہ جاتی ہے — اور خود پوشی کی آخری حد یہ ہے کہ اپنی شخصیت کے نقش کو جو قدرتی طور پر اس کے افکار و اعمال پر ثبت ہوتا ہے مٹا دینے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔

خود نمائی اور خود پوشی کی یہ دو رنگی اہلِ قلم میں بھی نظر آتی ہے بعض لکھنے والے ہیں کہ موقع بے موقع نوکِ قلم سے صفحۂ کاغذ پر ٹپکے پڑتے ہیں مگر بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جن کے قال میں اُن کا حال مذکور کیا مقدر بھی نہیں ہوتا۔ مولوی عبدالحق انہیں بزرگوں میں سے ہیں جو انا الحق سے "انا" کو حذف کر دیتے ہیں ایک مصنف خود پوشی میں کتنا ہی اہتمام کرتا ہو لیکن تو اپنی ہر تحریر کے اسلوب اور مضمون میں اپنی شخصیت کی ایک جھلک دکھانے پر مجبور ہے لیکن خاص کر اس وقت جب وہ دوسروں کی سیرت پر قلم اٹھاتا ہے اُس کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب اٹھ جاتا ہے اور دوں کے جوہر پرکھنے میں خود اس کے جوہر کھل جاتے ہیں — کتاب "چند عصر" سے خود مولوی صاحب کی سیرت کے متعلق کچھ ایسی "اندرونی شہادتیں" فراہم کی جاسکتی ہیں — کتاب کی علمی اور ادبی خوبیوں کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ معانی کا وزن اور عبارت کی سبک روی خیالات کی متانت اور بیان کی شگفتگی، جذبات کا جوش اور ان کے اظہار میں ضبط و اعتدال مولوی صاحب کی تحریر کے عام جوہر ہیں اور اس کتاب میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ واقعات کے جمع کرنے میں افراط و تفریط سے پرہیز جو علمی سیرت نگاری کی شرطیں ہیں، پوری طرح ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان خاکوں میں رنگ بھرنے میں جو اس قدر صحت کے ساتھ تیار کیے گئے ہیں مصنف کے قلم نے موقلم کا کام کیا ہے اور اس کے جان بخش اندازِ تحریر نے ان خاموش تصویروں میں جان ڈال دی ہے۔

لیکن اس وقت تو ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس رنگا رنگ مرقع سے مصنف کے رنگِ طبیعت کا کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ نقش کے اندر سے نقاش کو ڈھونڈھ نکالنے کا کام یہ مختصر مضمون پورا نہیں کرے گا۔ اس میں تو صرف چند اشارے ہیں جن سے شاید اُس شخص کو، جو اس مہم کو سر کرنے کا بیڑا اٹھائے، تھوڑی بہت مدد مل سکے۔ اس کے لیے ایک تو مولوی صاحب کے

واقعات زندگی تفصیل سے جاننے اور دوسرے نہ صرف "چند ہم عصر" بلکہ موصوف کی کل تصانیف کے گہرے مطالعے اور اُن کے افکار وخیالات کی نفسیاتی تحلیل کی ضرورت ہے۔ صرف اسی طرح سے کسی شخص کے حال کا اس کے قال اور خیال کی روشنی میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

کسی شخص کی سیرت کی گہرائیوں کو سمجھنے کے لیے خود اس کی شہادت کی بھی ضرورت ہے مگر بلاواسطہ شہادت اس معاملے میں اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی بالواسطہ شہادت۔ کیونکہ خود اپنا ذکر کرتے ہوئے انسان عموماً انکسار یا افتخار خودپوشی یا خودنمائی سے کام لیتا ہے اور اصلیت کو گھٹا کر یا بڑھا کر بیان کرتا ہے دوسروں کا ذکر کرتے وقت وہ غیر شعوری طور پر اپنی اصلی حالت ظاہر کر دیتا ہے۔ اگر اس کی شخصیت کا صحیح اندازہ مقصود ہو تو یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ وہ کن لوگوں کو پسند کرتا ہے اور ان کی کون سی صفات اسے کس حد تک متأثر کرتی ہیں اس نکتے کو مدنظر رکھ کر مولوی عبدالحق کی تنقیدی تحریروں خصوصاً "چند ہم عصر" کا مطالعہ کیجئے۔ ان رنگارنگ صورتوں میں خود ان کی سیرت کی جھلک دیکھیے اور عالم تصور میں اُن کی زبان سے یہ شعر سن کر لطف اٹھائیے:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

(جوہر، صفحہ ۱۱۵—۱۳۳)

خواجہ تہوّر حسین:

"چند ہم عصر" اور عبدالحق

مضمون نگار نے، عبدالحق کی شخصیت کو "چند ہم عصر" کی روشنی میں سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے مولوی عبدالحق نے ہر شخص کے کردار میں انسان دوستی کی صفت کو تلاش کیا ہے اور جہاں

اور جس میں یہ خوبی نظر آئی ہے، اُس کو اپنے خاص پیرائے میں بیان کیا ہے۔ انسان دوستی کا جذبہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کا نظریۂ اخلاق بلند نہ ہو۔ عبدالحق کا نظریۂ اخلاق اور لوگوں سے قدرے مختلف ہے۔ اُن کے اخلاق میں ایک خاص وسعت ہے اور وہ دوسروں میں بھی انسانیت کی یہ خوبی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ عبدالحق میں کام کرنے کی بے پایاں طاقت ہے۔ ہر کام کو وہ شوق اور انہماک سے انجام دیتے ہیں، وہ اپنے اس مجموعۂ مضامین میں جگہ جگہ کام اور وقت کی اہمیت کو بتاتے ہیں۔ عبدالحق کی شخصیت کا ایک پہلو ان کی بے باکی اور خودداری ہے۔ یہ جس طرح ان کی نجی زندگی میں نظر آتی ہے، اسی طرح ان کے مضامین میں بھی جھلکتی ہے۔ عبدالحق صحیح معنی میں حق کا بندہ ہے۔ پسپا ہونا یا ہمت ہار جانا اُس نے سیکھا ہی نہیں۔ بڑی سے بڑی مخالفت کا ہمیشہ ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ خوش پوشاکی اور خوش خوراکی کا گُر عبدالحق کو خوب معلوم ہے۔ ہر دو میں وہ اعتدال پسند نہیں۔ مولوی صاحب کی خوراک و پوشاک میں ایک صحت مند رجحان نظر آتا ہے دوسروں میں بھی وہ یہی خوبی تلاش کرتے ہیں۔ عبدالحق کو زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اُن کے ہر کام میں ایک خاص رکھ رکھاؤ ہے۔ ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ رقصاں رہتی ہے۔ اس عمر میں بھی ان کی زندہ دلی اور ظرافت شباب پر ہے۔ میں نے انہیں انتہائی پریشانی کے عالم میں بھی مسکراتے دیکھا ہے۔ اگرچہ اس مسکراہٹ میں تلخیٔ دوراں کی آمیزش کو محسوس کیا ہے اُن کی زندہ دلی اُن کی ہر تحریر سے نمایاں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ لطیف طنز کے چھینٹے بھی ان کی نثر میں نظر آتے ہیں بحیثیت نثار عبدالحق کا درجہ بہت بلند ہے اس صدی کا کوئی دوسرا نثر نگار اُن سے لگا نہیں کھاتا۔

خاکہ نگاری کے اعلیٰ نمونے ہمیں "چند ہم عصر" میں نظر آتے ہیں۔ اس ٹکر کی کوئی دوسری کتاب اُردو نثر میں نظر نہیں آتی، خاکہ نگاری کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ "میں" کا ذکر اس میں کم ہو۔ عبدالحق نے اس نکتے کو ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے مشاہدات کو چابکدست صناع کی طرح الفاظ میں ڈھال دیا ہے اور بظاہر سیدھے سادے الفاظ میں جہانِ معنی پوشیدہ کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر سے وہی تاثر قاری کے دل میں پیدا کر دیتے ہیں جو ان کا مقصد ہوتا ہے، یہ بڑی کامیابی ہے۔ اردو ادب کے نشاۃ ثانیہ سے عہد جدید تک جو جو تغیرات و انقلابات ہوئے ہیں اُن کا تماشہ عبدالحق کی آنکھوں نے دیکھا ہے، نہ صرف

دیکھا ہے بلکہ ایک سرگرم سپاہی کی مانند اس ادبی جہاد میں حصہ بھی لیا ہے اگر وہ اپنی "سوانح عمری" لکھنے پر غور کریں تو یہ اُردُو کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ (الشجاع. صفحہ ۸۹—۹۶)

ڈاکٹر خلیق انجم:

مولوی عبدالحق بحیثیت خاکہ نگار

مضمون نگار نے اُردُو میں خاکہ نگاری کا ارتقائی جائزہ لیتے ہوئے "خاکہ نگار" اور "مورخ" کے فرق کی وضاحت کے بعد مولوی عبدالحق صاحب کی خاکہ نگاری کا محاکمہ کیا ہے۔ اس کوشش میں غالباً "چند ہم عصر" کا کوئی پرانا ایڈیشن موصوف کے پیش نظر رہا۔ اس لیے کہ مضمون نگار نے لکھا ہے "چند ہم عصر میں اٹھارہ خاکے شامل ہیں جو ۱۹۰۰ء اور ۱۹۴۳ء کے درمیان لکھے گئے" حالانکہ "چند ہم عصر" کے آخری ایڈیشن میں چوبیس خاکے شامل ہیں جو ۱۹۰۱ء سے ۱۹۵۹ء کے دوران لکھے گئے۔ مضمون نگار نے "پروفیسر حیرت مرزا" کے خاکے کو شخصی اور سوانحی اشاروں کے خوبصورت امتزاج کی بہترین مثال قرار دیا ہے۔ موصوف کی اس رائے سے قطع نظر یہاں اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ پروفیسر حیرت مرزا کا خاکہ مولوی عبدالحق صاحب کا تحریر کردہ نہیں ہے۔ اس کی صراحت خود مولوی عبدالحق نے "چند ہم عصر" کے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۵۹ء میں ان لفظوں میں کی ہے:

"یہ مضمون میرا لکھا ہوا نہیں ہے۔ میرے ایک ایرانی نژاد دوست مرزا حیرت کا بچا کھچا کلام لائے تھے اور اس کے ساتھ یہ مضمون انگریزی میں لکھا ہوا مجھے دیا اس کا ترجمہ اور حیرت کا کلام دونوں رسالہ "افسر" میں شائع ہوئے۔ شیخ چاند مرحوم نے یہ سمجھ کر کہ یہ میری تحریر ہے، "چند ہم عصر" میں داخل کر دیا۔"

خاکہ نگار کا فوکس کوئی شخصیت ہوتی ہے وہ صرف اُن واقعات کو پیش کرتا ہے جس سے اس شخصیت کے بعض پہلو اُجاگر ہو سکیں ۔ مولوی عبدالحق شخصیتوں کی خوبیوں اور خامیوں کو بے کم و کاست بیان کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں حکیم امتیاز الدین اور محمد علی کے خاکے کامیاب ترین ہیں ۔ مولوی صاحب خاکے کے کینوس پر خود بہت کم نظر آتے ہیں ۔ اُن کے حسّاس طبع وسیع قلب اور انسان دوست ذہن میں ایک سپاہی، ایک مالی سے لے کر حالی اور سر سیّد جیسی ہستیوں تک سب کی گنجائش ہے ۔ ان کی قوت مشاہدہ جس قدر تیز ہے، اتنی ہی اس کے بیان پر اُنہیں قدرت ہے ۔ وہ ہر شخصیت کا مطالعہ ایمانداری سے کرتے ہیں ۔ ہم ان کی رائے سے اختلاف تو کر سکتے ہیں لیکن ان کی نیت پر کبھی شبہ نہیں کر سکتے ۔

مولانا واقعات کے انتخاب میں بہت محتاط ہیں، صرف ایسے واقعات بیان کرتے ہیں جن سے کسی شخصیت کے اہم پہلو اُجاگر ہو سکیں ۔ حالی، سر سید اور محسن الملک کے خاکوں میں انھوں نے ایسے ہی واقعات بیان کیے ہیں ۔

خاکہ کا فن بہت مشکل اور کٹھن فن ہے ۔ اسے نثر میں "غزل کا فن" کہا جا سکتا ہے ۔ غزل کی طرح خاکے میں محدود الفاظ میں طویل مطالب، مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے ۔ اس لیے خاکہ لکھنا بہت آسان ہے مگر اوّل درجے کا خاکہ لکھنا بہت مشکل ہے ۔

مولانا کے خاکوں میں جو بیان کی شگفتگی اور شیرینی ہے، کہیں کہیں سنجیدہ بذلہ سنجی اور شوخیِ گفتار ہے، تشبیہات و استعارات کا برجستہ استعمال، لب و لہجہ کی بے ساختگی اور محاوروں کی چاشنی ہے، اس نے ان خاکوں کو اُردو انشا پردازی کی بہترین مثال بنا دیا ہے ۔

ان خاکوں کی ایک اور بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں خود مولانا کی شخصیت بھی جھلکتی ہے غرض "چند ہم عصر" کا شمار اُردو کے بہترین خاکوں اور انشا پردازی کے بہترین نمونوں میں ہے اور مولانا اس کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تب بھی اُردو میں ان کا نام ہمیشہ عزت اور احترام سے صاحب طرز انشا پردازوں کے ساتھ لیا جاتا ۔ (مجلس، دکن، صفحہ)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

اُستاد، شعبۂ اُردو، کراچی یونیورسٹی

خطباتِ عبدالحق

اُردو میں بعض اکابر اور بزرگوں کے خطبات بوجوہ بڑے اہم اور وقیع شمار کیے جانے کے لائق ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان میں وہ ادبی شان نہیں جو ہمیں مولوی عبدالحق کے خطبات میں ملتی ہے۔

مولوی صاحب کے خطبات میں صرف ہیت و لہجہ نے ادبی آثار پیدا نہیں کیے بلکہ ان کے موضوعات کا بھی ہمارے ادب سے گہرا تعلق ہے اور ادبی نقطۂ نظر سے مولوی صاحب کے خطبات کی یہی ایک خصوصیت انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں مولوی صاحب کے یہاں بھی دوسروں کے خطبات کی طرح برعظیم کے تمام سیاسی رجحانات، ذہنی محرکات، معاشی مشکلات اور قومی انقلابات کا ذکر آیا ہے لیکن عام طور پر ان کے موضوعات پر ادبیات و لسانیات کا اثر غالب ہے، پھر چونکہ مولوی صاحب کے سادہ نگار قلم نے ان میں ایک خصوصی قسم کی "سادگی و پرکاری" اور "بیخودی و ہشیاری" کی کیفیت پیدا کر دی ہے، اس لیے ان کی اہمیت اُردو ادب کی تاریخ میں غیر معمولی ہو گئی ہے۔

مولوی صاحب کے خطبات، سننے والوں پر جادو کا اثر ڈالتے ہیں لیکن ان کا دائرۂ عمل صرف خطابت کی تنگ فضا تک محدود نہیں ہے بلکہ ان میں حاضرین کے حلقے سے باہر نکل کر دور تک ایک خاص فضا پیدا کرنے کی قوت ہے۔

خطابت عام طور پر صحافت کے قریب تر ہوتی ہے اور اس میں وقتی تاثر چھوڑ جانے کے سوا مستقل اثر پذیری کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے لیکن مولوی صاحب کے خطبات اس عیب سے پاک ہیں۔ اُن کے خطبات میں زود اثری کے ساتھ ساتھ ادب کے وہ دیرپا نقوش بھی پوری طرح ابھرے ہوئے ہیں جو کسی تحریک کو ادب کا اہم جزو بنا دینے میں مدد دیتے ہیں اور

جس کی مثالیں اردو میں بہت کم ملتی ہیں۔

خطباتِ عبدالحق کا خطباتی ادب میں وہی مقام ہے جو فنِ خطوط نگاری میں غالب کے خطوط کا مولوی صاحب کے خطبات میں کم و بیش وہی ادبی محاسن موجود ہیں جن کے لیے خطوطِ غالب کو شہرت حاصل ہوئی۔ سرسید اور حالی، غالب سے بہت متاثر تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی تحریریں غالب کی سادہ نثر کے آثار نمایاں ہیں۔ مولوی عبدالحق حالی و سرسید کی صحبتوں کے فیض یافتہ ہیں، اس لیے ان پر بلا واسطہ غالب کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ جس سادہ اور دل کش نثر نگاری کا آغاز میر امن نے کیا تھا، جس کو غالب نے شوخ و بے تکلف بنایا تھا اور جسے حالی و سرسید نے وسعت و جامعیت عطا کی تھی، مولوی عبدالحق نے اپنے خطبات کے توسط سے اس میں تکمیل کی شان پیدا کی ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے یہ خطبات برِعظیم میں رونما ہونے والے سیاسی و ادبی حالات کی مستند دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں جن واقعات و حالات اور قومی و ملّی رجحانات و تحریکات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ محض شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ و چشم دیدہ ہیں۔ ان میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں صرف مطالعہ کو نہیں بلکہ مشاہدہ و تجربہ کو براہِ راست دخل ہے اور اسی لیے ان میں واقعیت و صداقت کی ایسی روح موجود ہے جو تاریخ نگار کے یہاں بھی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ ان خطبات میں دس بیس سال کا نہیں تقریباً پوری ایک صدی کی اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز کا ذکر آیا ہے۔ ان میں قیام پاکستان کی اس ذہنی تحریک کا مکمل خاکہ موجود ہے جو مسلم لیگ کے قیام (۱۹۰۶ء) سے بہت پہلے سرسیّد کی اصلاحی تحریک کے عین آغاز سے وجود میں آ چکی تھی۔ ان خطبات میں سرسیّد احمد خاں کے قومی نظریے، ان کے سیاسی مسلک اور ان کے اصلاحی نقطۂ نظر کی وضاحت ہے۔ ان میں ہندو مسلمانوں کی ذہنی ساخت، ان کے طبعی رجحانات، دو قومی نظریے کی تحریک کے اسباب و محرکات، ان کے نتائج و تاثرات کی تفصیل ہے۔ ان میں اردو ہندی کے تنازعے اور اس تنازعے کے اسباب و علل کی مکمل تصویر ہے۔ ان میں اردو اور ہندی زبانوں کے آغاز، ارتقا، ان کے باہمی تعلقات اور عروج و زوال کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ ان خطبات میں پاک و ہند کی وہ سو سالہ تاریخ محفوظ ہے جس کا خاکہ اقبال اور ان سے پہلے سرسیّد اور ان کے رفقائے کار کے ذہنوں میں

تیار ہو چکا تھا اس ذہنی خاکے پر نظر ڈالے بغیر پاکستان کے موجودہ نقشے کو سمجھنا دشوار ہے ۔ یہ وہ چند باتیں ہیں جو مولوی صاحب کے خطبات کی تاریخی قدر و قیمت متعین کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

ان خطبات کی سوانحی اہمیت بھی مسلم ہے۔ مولوی صاحب کی زندگی اُن کی شخصیت، اُن کے کردار، اُن کی علمی و ادبی کارناموں کو مرتب کرتے ہیں..... ان کے خطبات سے سب سے زیادہ مدد ملتی ہے۔ ان میں بعض خطبے اور خطبات کے بعض اجزا تو مولوی صاحب کی خود نوشت سوانح حیات کا کام دیں گے۔ یہ خطبات مختلف مقامات اور مختلف حالات و ضروریات کے لیے لکھے گئے ہیں، اس لیے ان میں ایک طرح کی ہمہ گیری ہے اور مولوی صاحب کی زندگی و شخصیت کے مختلف پہلو ان میں صاف جھلک گئے ہیں۔ مولوی صاحب کے مقصدِ حیات، حوصلے، عزم، ہمت اور قوتِ مقاومت کے اندازے کے لیے ان خطبات کے مطالعے ہی کی ضرورت ہے۔ خطبات کو نظر انداز کر کے مولوی صاحب کی شخصیت کی رنگا رنگی، اُن کی زندگی کی ہمہ ہمی، ان کی ہمہ گیر واقفیت، اُن کی معاملہ فہمی، اُن کی خطابت، ان کے تبحرِ علمی، اُن کے اندازِ بیان اُن کی جدّتِ طبع اور لطیف و شوخ طبیعت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔

وہ موقع و محل، حاضرین اور اُن کے حالات کو اچھی طرح ذہن میں رکھ کر خطاب کرتے ہیں اسی لیے اُن کا تیر ہمیشہ نشانے پر جا کر بیٹھتا ہے۔ وہ کام کرنے کے عادی ہیں اور اپنے مخاطب کو ہمیشہ کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مولوی صاحب کے کردار و شخصیت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جامد اور اکھڑ نہیں لچک دار و سیّال ہے۔ وہ بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان طالب [illegible] میں طالب علم، مزدوروں میں مزدور حتیٰ کہ عورتوں میں عورت بڑی خوبی سے بن جاتے ہیں اور پھر اس ہم زبانی و ہم رنگی کی وجہ سے وہ ہر کس و ناکس، چھوٹے بڑے، بوڑھے جوان اور عورت مرد سب کو اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ اردو کی ترویج و اشاعت میں اُن کی شخصیت کے اسی پہلو نے انہیں ہر جگہ کامیاب بنایا ہے۔ صوفیائے کرام کی طرح وہ بھی اُردو کی اشاعت اور اپنے قومی [illegible] کی تبلیغ کے لیے [illegible] میں داخل ہوئے انہوں نے اپنی زبان اور اپنے خیالات

کو ان پر تھوپنے کی کوشش نہیں کہ بلکہ وہاں کے لوگوں میں گھل مل کر ایک ایسی خوشگوار فضا پیدا کی ہے کہ لوگ اردو سے دلچسپی لینے اور ان کے خیال کی تائید کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اُن کے تمام خطبات میں مخاطبہ کا یہی انداز ہے اور اس کی بدولت انہیں اپنے مقصد کے حصول میں غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔

ان کے خطبات سے ان کی طبیعت کی حوصلہ مندی کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے بظاہر اُن کے قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں لیکن اُن کے خطبات دیکھیے تو ان میں وہ حوصلہ مندی نظر آتی ہے جو نوجوانوں میں بھی مفقود ہے۔

حاصل یہ کہ مولوی صاحب کی زندگی کے اصل ترجمان ان کے خطبے ہیں۔ مولوی صاحب اور ان کے کاموں کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اُن کے خطبات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

خالص ادبی اور لسانی نقطۂ نظر سے یہ خطبات مولوی صاحب کے مقدمات سے کسی طرح کم نہیں ہیں اُن کے خطابیہ لب و لہجہ میں جو حلاوت، اثر اور دلکشی ہے وہ ان کی دوسری تحریروں میں مشکل سے ملے گی ان خطبوں میں ایسی سادگی، سلاست، صفائی، روانی، صداقت اور اثرانگیزی پائی جاتی ہے جو کسی دوسرے کے خطبوں میں نظر نہیں آتی۔ زبان و بیان کی خوبیوں سے قطع نظر ان کی ادبی اہمیت بھی مسلم ہے۔ ان میں تحقیق، تنقید اور اسلوب کے اہم مسائل زیر بحث آگئے ہیں۔ زبان کی ساخت و پیدائش، سوسائٹی اور زبان کے تعلق، زبان اور معاشرے کی ہم آہنگی، قومی عروج و زوال کی تاریخ میں زبان کی حیثیت، زبان اور ہمارا تہذیبی و ثقافتی سرمایہ، زبان اور قومی کردار اور اسی قسم کے بڑے مفید اور اہم موضوعات پر مولوی صاحب نے قلم اٹھایا ہے۔ زبان کے متعلق عموماً اور اردو زبان کے متعلق خصوصاً ان کی نظر بڑی گہری ہے اور وسیع ہے۔ اردو کی پیدائش، اس کے ارتقا اس کے ماخذ و مبدا اس کے اصول و قواعد اس کے عروج و زوال کے اسباب اس کے مزاج کی ساخت اور خصوصیات سے کماحقہ واقفیت کے لیے خطباتِ عبدالحق کا مطالعہ بہت ضروری ہے

ان خطبات میں واقعات و حالات کو صرف جمع ہی نہیں کر دیا گیا، مختلف مسائل کا حل بھی پیش کیا

گیا ہے۔ زبان و قوم کے ہر پہلو پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اور مختلف نظریات کی تنقید کرکے اُن سے مفید و اہم نتائج کا استخراج کیا گیا ہے۔

ادب و زندگی، زبان و سماج، تخلیق و تنقید، تحقیق و تاریخ کے مختلف النوّع مسائل ان میں زیرِ بحث آئے ہیں۔ ادب و زبان کے متعلق مولوی صاحب کے نظریات کا خلاصہ ان خطبوں میں پوری طرح موجود ہے۔ ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عملی تنقید کے علاوہ نظریاتی مسائل پر بھی بحسن و کمال قلم اٹھانے کی صلاحیت سے متصف ہیں۔ اُن کے ذہن میں فنی و ادبی نظریات واضح ہیں مسائل پر اُن کی نظر گہری ہے۔ انھوں نے اہم سے اہم اور مشکل سے مشکل مسئلے پر اپنی رائے کا بڑی جامعیت سے اظہار کیا ہے۔

بعض خطبات میں ادب و انسانیت، سوسائٹی اور ادب، زبان اور عورت، سیاست و زبان، اصطلاحات و محاورات، زبان کے اشتقاق، ماخذ کے اصول وغیرہ ایسے موضوعات پر بڑی عالمانہ بحث ملتی ہے۔ غرض مولوی صاحب کے خطبات میں مختلف علوم و فنون کی معلومات کا ایک گراں قدر ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔ وہ علمی و ادبی اور تاریخی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور اپنی جامعیت کے لحاظ سے انہیں تمام ادبی خطبات پر فوقیت و برتری حاصل ہے۔ ان خطبات کی حیثیت صرف تاریخی نہیں علمی، لسانی، تحقیقی، سوانحی، تنقیدی اور ادبی بھی ہے اور ان میں سے کوئی حیثیت نظر انداز کر دینے کے لائق نہیں۔ (الشجاع، صفحہ ۶۱ — ۶۹)

نثار احمد فاروقی:

استاد شعبۂ عربی، دہلی کالج دہلی

مولوی عبدالحق کا اسلوب

فاروقی صاحب نے "طرزِ نگارش،، کی لغوی تعریف و توضیح اور اسٹائل کے محاسن اور عناصرِ ترکیبی سے بحث کے لیے کئی صفحے وقف کیے ہیں اور اس میں کام کی بہت سی باتیں سمٹ آئی ہیں۔ اسلوب

افکار و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا ایسا پیرایہ ہے جو دل نشین بھی ہو اور منفرد بھی۔ اسٹائل میں ہمیشہ کاوش، صنّاعی اور مرصّع کاری کا عنصر ضروری سمجھا گیا ہے۔ خیال تو خیر بنیادی چیز ہے لیکن اسٹائل مصنف کے ذہن کی گونج بعد میں ہوتا ہے، محنت اور مرصّع کاری کا طالب پہلے۔

مولوی عبدالحق بے شبہ ایک "صاحب طرز" انشا پرداز ہیں۔ اُن کی تحریر میں حالی کی حلاوت اور سادگی، متانت اور وقار، شبلی کی رنگینی اور اوانجی، مہدی کی لطافت و نظافت، نذیر احمد کی محاورہ بندی، رشید احمد صدیقی کی رعایتِ لفظی اور صوتی توافق کا لحاظ، عبدالماجد دریا بادی کے طنز اور فرحت اللہ بیگ کے مزاح کا نہایت دل نشین اور خوشگوار مرکب ملتا ہے۔ بایں ہمہ اُن کا منفرد لب و لہجہ اُن کی نثر میں موجِ تہہ نشیں کی طرح سرایت کیے ہوئے ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو ایسا لب و لہجہ دیا ہے جو سب اصنافِ نثر کے مزاج سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ صحیح، صاف، سادہ، دل نشین اور سنجیدہ نثر لکھنے کی جو روش عبدالحق نے ایجاد کی ہے، اسے اردو کی معیاری نثر کہا جا سکتا ہے۔

عبدالحق کی نثر کا حُسن یہ ہے کہ وہ سائنٹفک ہوتی ہے۔ وہ کبھی دور از کار، پادر ہوا اور معلق بات نہیں کرتے، نہ حشو و زوائد سے "پچی کاری" کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ عبدالحق کی شگفتگی، اُن کے خطوں میں اپنے شباب پر ہوتی ہے۔ اگر اُن کے بے تکلف خطوط کا ایک عمدہ انتخاب شائع کیا جائے تو وہ غالب، مہدی، افادی اور محمد علی ردولوی کے خطوط کا نفیس مرکب ہوگا۔ ان کا اسٹائل جدید نظریۂ اسالیب سے زیادہ قریب اور اظہار و ابلاغ کے لئے بہت مؤثر ہے۔ وہ اِس طرح لکھتے ہیں کہ اسٹائل کے سامنے موضوع کی اہمیت کم نہیں ہوتی ان کا اسٹائل اظہار و ابلاغ کے لیے بہت مؤثر ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بھرپور لفظوں میں بے تکلف کہہ دیتے ہیں اور یہی اسٹائل کا مقصد و منتہیٰ ہے۔

(مجلسِ دکن صفحہ ۱۰۴—۱۱۹)

ڈاکٹر ثمینہ شوکت :

لیکچرار اُردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن

مولوی عبدالحق کا اسلوبِ بیان

اسلوب، ایک سماجی اور جمالی مظہر ہے۔ ادیب اسی کے توسط سے اپنے پڑھنے والوں تک رسائی حاصل کرتا ہے ان کے دل میں گھر پیدا کرتا ہے اور ان کی جمالی حس کو متاثر کرتا ہے۔ ادیب میں کم سے کم اتنی صلاحیت ضروری ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ذہنوں کو مطمئن کر سکے اور انہیں آسودگی بخش سکے یہ خصوصیت جیسی مولوی عبدالحق کے یہاں نمایاں ہے اس کے نمونے کم ہی نظر آتے ہیں۔

مولوی صاحب کے اسلوب کا نمایاں پہلو، بول چال کی زبان کے عناصر کا آزادانہ اور شگفتہ استعمال ہے لیکن وہ قصداً اس کے مواقع پیدا نہیں کرتے ان کا جمالی ذوق جب بلند ہوتا ہے تو وہ الفاظ اور ترکیبوں کو بڑے شاطرانہ انداز میں برت جاتے ہیں۔ اس طرح اُن کی سادگی میں پُرکاری اور پُرکاری میں سلاست، سلاست میں رنگینی و بے تکلفی اور بے تکلفی میں ایک رکھ رکھاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جب قلم پر اُن کا قابو، بیان پر ان کی دسترس اور خوش گفتاری میں ان کی طبعیت کا رچاؤ نمایاں ہوتا ہے۔ ان کا انداز سرد مہرانہ اور "کیٹلاگی" نہیں ہے بلکہ تحقیقاتی مضامین میں بھی وہ سلاست اور شگفتگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کسی میدان میں ان کے قلم کی روانی اور انکی طبیعت کی جولانی میں فرق نہیں آتا۔ ان کی پیش کشی کا انداز ہمیشہ واضح رہتا ہے اور یہی ان کے اسلوب کی انفرادیت ہے۔

مقدمات ان کی ساری ادبی تصانیف پر بھاری ہیں ان کا ایک ایک حرف ان کی نکتہ رسی، باریک بینی اور ان کے تنقیدی شعور کا مظہر ہے جس سے ان کی تحریروں کا رنگ چوکھا ہو گیا ہے اردو زبان و ادب کے پائیدار اقدار کی حفاظت اور نگہداری میں وہ بے قرار ہو کر، بے اختیار لکھتے ہیں۔ سوانحی انشائیوں میں جھوٹی رنگ آمیزی کی جگہ بے رنگ حقیقت نگاری کو راہ دیتے ہیں

اور معاصرین کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی ترجمانی اور تجزیہ کرتے ہوئے وہ سوانح نگار سے زیادہ زندگی کے نقاد معلوم ہونے لگتے ہیں یہاں سادگی اور وقار ایک معیار ہے جیسے ایلورہ کی صورت گری ہو لوی عبدالحق کی تحریروں میں سرسید کی سادگی ہے لیکن سرسید کے مقابلے میں مولوی صاحب کے ہاں سادگی اور سلاست میں بھی ایک سنجیدہ معیار شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ حالی کے مقابلے میں مولوی صاحب کا اسلوب زیادہ سلیس اور واضح ہوتا ہے۔ وہ حالی کی طرح مسائل سے الجھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ بڑے سلیقہ سے ان سے گزر جاتے ہیں اور اپنے اندازِ بیان کو گرانبار نہیں ہونے دیتے۔

ان کی مستقل سوانحی تنقید "نصرتی" شرابِ کہنہ کا نئے پیالوں میں چھلکاؤ ہے۔ تفصیلات کی عدم موجودگی کے باوجود انھوں نے اپنے اسلوب کے اعجاز سے، نصرتی کی تصویر کے خاکے میں جو رنگ بھرے ہیں، وہ قابلِ دید ہیں۔

سادگی، مولوی صاحب کی زندگی کا اسلوب بن چکی ہے اور اس کا اثر ان کے تمام ادبی کارناموں میں حسن بن کر جھلک رہا ہے۔ (مجلس، دکن، صفحہ ۱۶۰ — ۱۶۴)

ڈاکٹر سیّدہ جعفر:

شعبۂ اردو، نظام کالج، حیدرآباد دکن

عبدالحق کے تنقیدی تصوّرات

مولوی عبدالحق، مغربی اور مشرقی اصولِ نقد سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اپنے تنقیدی مضامین اپنے خطبات اور مقدمات میں انھوں نے ان دونوں سے کام لیا ہے اور انہیں بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ انہیں [illegible] شعور ہے کہ مشرقی ادب کو مغربی اصولِ تنقید سے جانچا تو جا سکتا ہے لیکن ہر ادب اور زبان کا ایک خاص [illegible] دار اور ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے جس کی طرف نقاد کو بہر حال متوجہ رہنا چاہیے اور اس سے

بے اعتنائی، نقاد کو گمراہ بھی کر سکتی ہے۔

مولوی عبدالحق اپنی تنقید میں کارنامے کے ماحول اور ان تمام سماجی اور تاریخی محرکات اور عوامل اور اس سارے پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہیں جس میں اس مخصوص تخلیق نے جنم لیا ہے۔ وہ تنقید میں ترقی پرور رجحانات سے گریز نہیں کرتے بلکہ انھوں نے اپنی تحریروں میں نئے ادبی میلانات کا خیر مقدم کیا ہے۔ انہیں اس کا بھی احساس ہے کہ نئے حالات میں ادب کو نیا روپ دھارنا ہے اس لیے اس کی جانچ پرتال کے پیمانے اور اس کے حُسن و قبح کی جانچ میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے۔ وہ ادب اور زبان کو ایک حرکی قوت اور نامیاتی حقیقت سمجھتے ہیں، لیکن وہ اپنی جدت پسندی کے باوجود اس خیال کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں کہ ادب کو ماضی کے تمام روایات سے ناتا توڑ لینا چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ ادب اگر قدیم سرمائے سے بالکل قطع تعلق کر لے تو اپنی ترقی کی راہ میں...... اولین منزل تک پہنچ نہ سکے گا۔

ان کا نظریۂ تنقید بہت وسیع، ہمہ گیر اور رنگا رنگ تصورات سے مرکب ہے۔ انھوں نے تنقیدوں کو کسی ایک اصول کا پابند نہیں بنایا۔ ان کے پاس بہت سے تنقیدی مکاتب خیال کے اثرات کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔ ان کی تنقیدیں سائنٹفک اسکول کی بھی نمائندگی کرتی ہیں، ان میں تاثراتی تنقید کا پرتو بھی جھلکتا ہے اور تقابلی انداز بھی پایا جاتا ہے۔ تحقیق ان کے ادبی مزاج کا سب سے اہم عنصر ہے جو جگہ جگہ نمایاں ہوتا ہے۔ جب تک وہ کسی ادبی اکتساب کے تمام پہلوؤں کو تحقیق کی روشنی میں جانچ نہیں لیتے، اس وقت تک فنی خصوصیات اور اصولی نظریات کو اس پر منطبق کر کے عملی تنقید کی طرف قدم نہیں بڑھاتے۔ وہ حالی کے مسلکِ تنقید سے کافی قریب دکھائی دیتے ہیں لیکن حالی کے بتائے ہوئے اصولِ تنقید ان کے نزدیک حرفِ آخر نہیں...... احساس کی شدت، تنقیدی شعور کی پختگی اور ادبی ذوق کے رچاؤ نے عبدالحق کی تنقیدوں کو قابلِ قدر بنا دیا ہے۔

(مجلس، دکن، صفحہ ۱۵۱ — ۱۵۶)

نواب منظور جنگ بہادر :

مولانا عبدالحق کی تنقیدات اور مقدمات پر ایک نظر

مولوی صاحب نے اپنا سب کچھ اُردو کی سیوا میں وقف کر دیا ہے۔ اُن کا عہدِ پیری، اردو کے چاؤ میں شباب سے بدل گیا ہے اس عمر میں بجائے خدا خدا کرنے کے وہ اُردو کے کرٹے لگاتے اور گیت گاتے کبھی پورب پچھم کو نکل جاتے ہیں اور کبھی اتر سے دکھن کا سپاٹا بھرتے ہیں۔

ان کی دیگر مستقل تصانیف اور تراجم سے قطع نظر کرکے صرف شعبہ زیر بحث کا جائزہ لیا جائے تو لے دے کے تین مجلدات دکھائی دیتے ہیں۔ مقدمات، متفرق کتابوں اور رسالوں سے لے کر محمد بیگ صاحب نے طبع کرائے خود ایک دیباچہ لکھا، مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی سے ایک تقریظ لکھائی یہ کتاب ۱۹۳۱ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی اور جلد ہی ناپید ہوگئی۔ مولانا کی تنقیدات کی ترتیب کا سہرا آغا علی خاں باز صاحب کے سر رہا۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں تنقیدات کو مدوّن کرکے چھپوایا۔

مولانا کے مقدمات اور تنقیدات میں اچھی خاصی "ریسرچ ورک" کی شان ہوتی ہے۔ ان کو خیالی باتوں کے طوطا، مینا بنانے نہیں آتے۔ وہ بال کی کھال نکالتے ہیں۔ دلائل سے 'روایت و درایت سے دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کرکے بتادیتے ہیں۔ اندازِ بیان رسیلا اور چاشنی دار ہوتا ہے۔ روکھے پھیکے مضمون کو بھی وہ ایسی لطافت اور بے ساختگی سے ادا کر جاتے ہیں کہ لاکھ آرائش اور صناعیاں اس پر قربان ہیں تنقیص کا اسلوب بھی نرالا ہے اور وہ بھی حلاوت سے خالی نہیں ہوتا۔ تنقید کے وہ اجزا جن میں صلاح نیک اور اصلاح کا اشارہ ہوتا ہے، قدر و قیمت میں انمول ہوتے ہیں۔ محاسن خواہ معمولی اور غیر اہم ہی کیوں نہ ہوں ان کو وہ اتنا سراہتے ہیں کہ معائب آپ ہی آپ دل پسند اور شربت کے گھونٹ بنکر حلق سے اترتے جاتے ہیں۔ وہ دُکھتی رگ پر انگلی رکھتے ہیں اور آگے نکل جاتے ہیں۔ حقائق کو بیان کرنے میں مولانا عبدالحق کہیں چوکتے ہی نہیں۔ حق گوئی اُن کا شعار رہا اور سچی بات کہنے

ہیں وہ بے دھڑک ہیں، کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔

مرزا غالب کا کلام مولانا عبدالحق کا رفیقِ مکتب ہے۔ نہ صرف یونیورسٹی کی چار دیواری تک ان کا ساتھ دیا بلکہ اس کے بعد بھی جلوت دخلوت میں اس کو انھوں نے حرزِ بازو ہی بنائے رکھا۔

مولانا کے مقدمات دورِ حاضرہ کے ادبیات کا انمول خزینہ ہیں۔ مقدمہ نویسی بھی چند زینے اوپر تنقید کا جزو اور ضمیمہ شمار کی جاتی ہے۔ مولانا نے بعض موضوعات کے متعلق اپنے مقدموں میں ایسے باریک نکات حل کیے ہیں اور موشگافیاں فرمائی ہیں کہ خود مصنف کی پہنچ بھی وہاں تک نہ ہو سکی۔ وہ مقدمہ نہیں لکھتے علم و فضل کی مسند پر بیٹھ کر درس دیتے ہیں اور حشو و زوائد کو ٹکسال باہر کرتے جاتے ہیں۔ حالی نے اپنے دیوان پر ایک محققانہ اور عالمانہ مقدمہ لکھ کر اردو میں مقدمہ نگاری کا نقشِ اوّل قائم کیا اس کے بعد مولانا عبدالحق نے اس زمین کو آسمان بنا دیا۔

اُن کے ہر مقدمے میں چشمِ بینا کو نئی روشنی ملتی ہے اور اُن کا ہر جملہ ایسا مؤثر اور نپا تلا ہوتا ہے کہ اردو متاعِ ادب کی فضیلت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ ادق مسائل کو سہل اردو میں لکھنا بہت دشوار ہے۔ قدرت کا یہ ایک عطیہ ہے جو مولانا کی قسمت میں تھا۔ اس عہد میں علمی اور دقیق مسائل کو سلیس اردو جامہ سب سے پہلے مولانا حالی نے پہنایا اور اس باب کی تکمیل مولوی عبدالحق صاحب نے کی۔

(جوہر، صفحہ ۱۰۲—۱۱۴)

یونس احمر:

ترجمے کی اہمیت - مولوی صاحب کی نظر میں

دکن میں مولوی عبدالحق کے زیرِ انتظام "دارالترجمہ" قائم ہوا تھا۔ اس ادارے کی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں۔ مولوی صاحب کی نگرانی میں سائنس اور دوسرے دقیق موضوعات پر غیر ملکی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ غیر ملکی زبانوں کی اصطلاحات کا بھی اردو میں ترجمہ کرایا گیا۔ مولوی صاحب نے ہمیشہ اپنی تحریروں

اور تقریروں میں اچھے ترجموں پر زور دیا ہے اور بڑے شد و مد سے اپنی نگرانی میں اس اہم اور مشکل کام کا آغاز کیا اردو ادب مولوی صاحب کے اس کارنامے کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ دارالترجمہ کے علاوہ مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کی طرف سے دوسری زبانوں کے چند ایسے ادبی و علمی شہپاروں کا ترجمہ کروایا جن سے اردو ادب میں "قیمتی اضافہ" ہوا۔ کالی داس کی مشہورِ زمانہ کتاب "شکنتلا" کو اردو میں ترجمہ کے لیے مولوی صاحب ہی نے منتخب کیا۔ اسی طرح مولوی صاحب کا دوسرا کارنامہ "نعرۂ شباب" کی اشاعت ہے۔ اس کتاب میں قاضی نذرالاسلام کی اُن بنگالی نظموں کے تراجم ہیں، جن کا ترجمہ اختر حسین رائے پوری نے براہِ راست بنگالی سے کیا ہے، اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس سے قاضی نذر اسلام، اوّل اوّل اردو داں طبقے میں روشناس ہوئے۔ مولوی صاحب جس کتاب کا ترجمہ کرانا چاہتے ہیں، ویسے ہی تجربہ کار اور منجھے ہوئے مترجم کا بھی انتخاب کرتے ہیں۔ شکنتلا کے ترجمے کے لیے اختر حسین رائے پوری کا انتخاب ان کی بصیرت کی معمولی شان ہے۔

(الشجاع، صفحہ ۹۷ — ۹۹)

انور عنایت اللہ:

بابائے اُردو کی ریڈیائی تقریریں

ڈاکٹر مولوی عبدالحق برعظیم ہند و پاک کے اُن گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جنہیں پیدائشی براڈ کاسٹر کہا جاتا ہے۔ زبانی جمع خرچ سے انہیں ہمیشہ نفرت رہی، اس لیے جب بھی انہیں ریڈیو پر تقریر کی دعوت دی گئی، انھوں نے خوشی سے اسے قبول نہیں کیا لیکن جب بھی آئے ایک اچھی ریڈیائی تقریر کی اعلیٰ مثال قائم کر گئے۔

زبان کی سادگی، چھوٹے چھوٹے، سیدھے سادے جملوں کا استعمال، عربی اور فارسی کی مشکل ترکیبوں کی نسبت اُردو کی عام فہم ترکیبوں اور آسان لفظوں کا استعمال اچھی ریڈیائی تقریر کا لازمہ ہے اور ان خصوصیات دلوازمات کی مولوی صاحب کے ہاں فطرتاً ارزانی ہے۔ وہ ہمیشہ مؤثر انداز میں راست رسائی کے قائل ہیں

ہیں اور اس خوبی نے ان کی ریڈیائی تقریروں کو امر بنا دیا ہے!

گزشتہ دس بارہ برس میں ڈاکٹر عبدالحق نے حالی، سر سید، نواب محسن الملک، اقبال وغیرہ کے بشمول برعظیم کی بیسیوں بڑی شخصیتوں پر تقریریں نشر کیں۔ ان تقریروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مولوی صاحب کے دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی آواز ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر جملہ اثر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی یہ ساری نشری تقریریں نہ صرف اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں بلکہ یقیناً آنے والی نسلیں ان سے مستفید ہوں گی اور انہیں یہ معلوم کرنے میں آسانی ہوگی کہ ریڈیو کے لیے اچھی تقریریں کیسے لکھی جاتی ہیں

(الشجاع، صفحہ ۸۵ — ۸۸)

مولوی سید ساجد علی:

مہتمم تعلیمات ضلع اورنگ آباد

مولوی عبدالحق صاحب اور انتظام

مضمون میں مولوی عبدالحق صاحب کی انتظامی صلاحیتوں کی طرف جستہ جستہ اشارے کیے گئے ہیں انتظام کے معنی منتظم کی قابلیت، منتظم کی اشیا شناسی، انتظام اشخاص، تربیتِ کار اور خود کام کرنے اور لینے کی قابلیت سے زیادہ بحث کی گئی ہے۔

مضمون نگار کے نزدیک منتظم میں قابلیتِ ایجاد و اختراع ہو، وہ انسان ہو، انصاف پسند اور جری ہو اور مولوی صاحب میں یہ سب خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

(نورس، دکن، صفحہ ۱۱۳ — ۱۲۵)

مولوی سید ساجد علی :

سابق نائب ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن

مولوی عبدالحق اور تعلیمات

مولوی صاحب نے جو عملاً عمر بھر کیا عام طور سے لوگ اُس سے ناواقف ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نہ تو خود مولوی صاحب نے اپنے تعلیمی تجربوں کا کہیں تفصیل سے ذکر کیا ہے اور نہ کسی اور نے اُن کے اس کام پر کچھ لکھا ہے۔ مولوی صاحب کے ماتحت مَیں نے ایک مُدرّس اور اضلاع کے مہتمم تعلیمات (انسپکٹر آف اسکولز) کی حیثیت سے عرصۂ دراز تک کام کیا ہے اُن کی تعلیمی کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں شریک رہا ہوں۔ اکثر دوروں میں اُن کی ہم راہی کا شرف حاصل رہا ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مَیں نے ان کے تعلیمی خیالات اور نظریات کے کوئی نوٹ نہیں رکھے ہیں، یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں، اپنی یاد سے لکھا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اس میں ان کے دو مضامین تاریخ اور فلسفہ تھے۔ ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آگئے اور مدرسۂ وسطانیہ آصفیہ کے صدر مدرّس مقرر ہوئے۔ اب یہ مدرسہ فوقانیہ ہو گیا ہے اور اس کے حدود میں ممتاز سائنس کالج بھی قائم ہے۔ اس مدرسے کے قریب ایک چبوترا ہے جسے اب تک مولوی عبدالحق صاحب کا چبوترا کہا جاتا ہے، مولوی صاحب صبح کے وقت وہاں جاکر بیٹھا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ "صرفِ خاص" کے فوجیوں کے بچّوں کے لیے قائم ہوا تھا۔ حیدرآباد میں اب تک ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اس مدرسے میں مولوی صاحب کے زمانۂ صدارت میں تعلیم پائی تھی۔ وہ ان کے دل چسپ طریقۂ تعلیم اور محبت آمیز برتاؤ کا ابھی تک ذکر کرتے ہیں۔ جب یہ مدرسہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گیا اور نواب سر بلند جنگ معتمد محکمۂ تعلیمات ہوئے تو انھوں نے مولوی صاحب کو اپنی مددگاری میں لے لیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ریاست حیدرآباد میں زیادہ تر مشرقی علوم پر توجہ کی جاتی تھی۔ شہر حیدرآباد میں صرف ایک نظام

کالج تھا جس میں انگریزی کی تعلیم ہوتی تھی اور یہ مدراس یونیورسٹی سے ملحق تھا۔

اس کے بعد مولوی صاحب صوبہ اورنگ آباد کی مہتممیٔ تعلیمات پر فائز ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ اس صوبے کے چار ضلعوں کے لیے ایک مہتمم تعلیمات مقرر تھا۔ مولوی صاحب چاروں اضلاع کا دورہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں زیادہ تر تحتانی مدارس تھے جن میں چوتھی جماعت تک تعلیم ہوتی تھی اور اس آخری جماعت کا امتحان سرکاری ہوتا تھا۔ سندیں دی جاتی تھیں اور اس حد تک تعلیم کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ گنتی کے وسطانیہ مدارس بھی تھے۔

جب ریاست میں تعلیم کی ترقی ہوئی تو مولوی صاحب کے ماتحت چاروں ضلعوں میں مہتممانِ تعلیمات مقرر ہوگئے۔ اب ان کے دفتروں کی تنقیح بھی ان کو تفویض کر دی گئی۔ اس صدر مہتممی کے زمانے میں مولوی نے بڑے کام کیے۔ جامعہ عثمانیہ، سررشتہ تالیف و ترجمہ، مدارس فوقانیہ کا کثرت سے قیام، مہتممانِ اضلاع کے دفتروں کی تنظیم اس زمانے کے ان کے کارنامے ہیں۔ اس خدمت سے سبکدوش ہوئے تھے کہ اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔ اس کے اختتام پر جامعہ عثمانیہ میں کچھ عرصے کے لیے اردو کے پروفیسر رہے۔ اس مختصر تذکرہ حالات سے ظاہر ہوگا کہ مولوی صاحب نے تعلیمات کا عملی کام کتنا کیا ہے۔ اس دوران میں انھوں نے کیسے کیسے تعلیمی مسائل نہ حل کیے ہوں گے۔

مولوی عبدالحق صاحب چاہتے تھے کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کو بدلا جائے۔ یہ ذریعہ ہندوستانی ہو تاکہ طلبا میں قومیت کا احساس زندہ ہو۔ وہ جو کچھ پڑھیں اور لکھیں اُن کے دماغوں کا جزبنے۔ ان کے ذہن ترقی کریں۔ اُن کی سیرت سازی صحیح طریقے پر ہو۔ ان اغراض کے لیے مولوی صاحب نے اُردو زبان کو منتخب کیا۔ اس وقت جن لوگوں کے ہاتھ میں عنانِ تعلیم تھی وہ اکثر کم نظر تھے مگر مولوی صاحب موقع کے منتظر رہے۔ جب سر اکبر حیدری ریاست حیدرآباد میں معتمد تعلیمات ہوئے تو مولوی صاحب نے اُردو کے ذریعے تعلیم دینے کا انتظام کرنے کی تجویز ان کے روبرو پیش کی۔ حیدری مرحوم آدمی ذہین تھے۔ وہ مولوی صاحب کے مؤید ہوگئے۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان نظام ریاست نے اس تجویز کو شرفِ قبولیت بخشا اور عثمانیہ

یونیورسٹی قائم ہوگئی۔

سوال یہ پیدا ہوا کہ جدید علوم کی اردو میں کتب کس طرح فراہم کی جائیں۔ اس کے لیے مولوی صاحب نے ہی یہ تجویز پیش کی کہ ایک سررشتہ تالیف و ترجمہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ اس کا انتظام کیا گیا اور ایسے قابل علما اور ادیب جمع کیے گئے جو علوم و فنون اور اردو اور انگریزی زبانوں سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے اور خود مولوی صاحب اس کے ناظم بنائے گئے۔ وضع اصطلاحات کے لیے کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ مولوی صاحب ہندوستانی طلبا کے لیے مشرقی اور مغربی علوم دونوں کا حصول ضروری خیال کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے مشوروں کی بنا پر جامعہ عثمانیہ کا نصاب اس طرح مرتب کیا گیا کہ دونوں قسم کے علوم کو باہم سمو دیا گیا

مولوی صاحب ہمیشہ اس فکر میں رہے کہ کسی طرح جامعہ عثمانیہ کو ایسے معلّمین مل جائیں جو وقفِ تعلّم و تعلیم ہوں۔ حکومت ان کی معاشی ضروریات اس حد تک پوری کر دے کہ وہ یکسوئی سے اپنے فرائضِ معلّمی انجام دے سکیں۔ اس وجہ سے وہ کہا کرتے تھے کہ کاش جامعہ عثمانیہ اورنگ آباد میں قائم کی جاتی جہاں اساتذہ صاحبان، حیدر آباد کی سازشوں، سفارشوں اور ترقیوں کے لیے پیرویوں اور خوشامدوں سے محفوظ رہتے اور تعلیم میں ہمہ تن مصروف رہتے۔

مولوی صاحب صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تھے۔ اس کے ساتھ حیدر آباد میں سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے ناظم کے فرائض بھی ان کے ذمّے تھے۔ ایک مرتبہ مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کی بڑی جماعتوں کے طلبا نے ایک مدرّس سے ناراض ہو کر ہڑتال کر دی اور مولوی صاحب، ناظم صاحب تعلیمات اور صدر المہام تعلیمات کو تار دے دیے کہ مدرّس صاحب نے ہماری تذلیل کی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب حیدر آباد سے اورنگ آباد آئے۔ حالات معلوم کیے اور باتوں باتوں میں صدر مدرّس سے کہا: "طلبہ میں کچھ جان آ رہی ہے"۔ اس کے بعد طلبا کو جمع کر کے ایسی پُر اثر تقریر کی کہ وہ آب دیدہ ہو گئے، ہڑتال ختم ہو گئی۔ شام کے وقت مولوی صاحب نے ان طلبا کو چائے پلائی۔ وہاں بڑی دل چسپ باتیں ہوئیں جن میں ہڑتال کا ذکر نہیں آیا۔

مولوی صاحب طلبا کو دل سے چاہتے تھے۔ ان کو اجازت تھی کہ جس وقت چاہیں ان سے مل

سکتے ہیں۔ وہ اُن کی کافی مالی امداد کرتے اور اُن سے دل چسپ باتیں کرتے مگر نصیحت بہت کم کرتے۔ جب کبھی کوئی غریب ہونہار طالب علم اُن کو نظر آتا اس کی نہ صرف مالی امداد کر کے اُس سے جامعاتی تعلیم کی تکمیل کراتے بلکہ حکومتِ حیدر آباد سے سفارش کر کے سول سروس کے امتحان میں شریک کراتے اور اس کی ملازمت کے لیے بھی کوشش کرتے۔

مولوی صاحب کو اُصولِ تعلیم، فنِ تعلیم، تاریخِ تعلیم اور نظاماتِ تعلیم کی کتابیں پڑھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ میں جب کبھی تدریسی مسائل کے سلسلے میں مولوی صاحب سے کسی فنی کتاب کا ذکر کرتا تو اکثر معلوم ہوتا کہ مولوی صاحب نے وہ کتاب دیکھی ہے۔ مولوی صاحب کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ اساتذہ اصول و فنِ تعلیم سے آگاہ ہو جائیں مگر ان پر آنکھ بند کر کے عمل نہ کریں۔ اس غرض سے شہر اورنگ آباد کے اساتذہ کی ایک انجمن قائم کی تھی اور اس کے تحت ماہانہ جلسے ہوتے تھے۔ ایک مدّرس، ایک جماعت کو عملی سبق دیتا۔ دوسرے مدرسین اسے دیکھتے اور آخر میں تنقید کرتے۔ مولوی صاحب صدارت کرتے اور اپنی صدارتی تقریر میں سبق اور نکتہ چینی پر تبصرہ کرتے جس سے فنِ تعلیم سے ان کی واقفیت معلوم ہوتی تھی۔ مدرسوں میں اُردو کے قاعدے جاری تھے۔ یہ طلبا کی نفسیات کے مطابق نہ تھے۔ مولوی صاحب نے بتایا کہ اُردو کی الف، بے درحقیقت ناموں کے اجزا ہیں مثلاً الف کے معنی ہزار کے ہیں اس کا پہلا جز "ا" سے لے لیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے "طریق الصوت" پر قاعدہ لکھوایا اور اس کی کلید بھی مرتب کرائی۔ اپنے دوروں اور کانفرنسوں میں اساتذہ کو جمع کر کے عملی سبق دلوائے۔ اس قاعدے سے یہ فائدہ ہوا کہ بچّے دل چسپ طریقے پر اُردو کا قاعدہ کم و بیش تین ماہ میں ختم کر لیتے تھے۔

تحتانی مدرسوں کے لیے ایسی کتابوں کے لکھنے کی ضرورت تھی جن کے ذریعے زبان دانی کے ساتھ ساتھ طلبا کو جدید معلومات بھی حاصل ہوں۔ کام مشکل تھا۔ مولوی صاحب نے یہ کتابیں اپنی رہنمائی میں لکھوائیں۔ خود بھی بہت سے اسباق لکھے۔ مولوی صاحب بچوں کی نفسیات کو خوب سمجھتے ہیں انھوں نے ریڈروں کو طلبا کے لیے بہت دل چسپ بنا دیا۔

مولوی صاحب طلبا کو ہمیشہ یہ مشورہ دیتے تھے کہ انشا پردازی کے لیے مشق کی ضرورت ہے۔

انھوں نے ایک معائنۂ مدرسہ کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ "لکھنا، لکھنے سے آتا ہے" طلبا میں انشاپردازی کا شوق پیدا کرنے کے لیے ۱۹۲۵ء میں اورنگ آباد کالج سے ایک رسالہ "نورس" جاری کیا۔

ہندوستان میں نیچ ذاتوں کی پسماندگی اور بے چارگی کو دیکھ کر مولوی صاحب کا دل بہت دکھتا تھا وہ مہتممانِ تعلیماتِ اضلاع کو ہمیشہ سرکاری اور غیر سرکاری طور سے ہدایت کرتے رہتے کہ ان کی تعلیم پر خاص توجہ کی جائے اور ضلع کی سالانہ رپورٹوں میں ان کی تعلیمی حالت کا تفصیل سے ذکر کیا جائے میں نے ایک مرتبہ رپورٹ میں ان کی تعلیم کا ذکر علاحدہ سُرخی قائم کر کے نہیں کیا بلکہ ضمناً کر دیا تو مجھے لکھا کہ:

"میں نے آپ کو بارہا تاکید کی کہ ان بے بس اور بے کس نیچ ذاتوں کی تعلیم کا ذکر رپورٹ میں خصوصیت سے کیا جائے مگر آپ نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا ـــ کیا سید بھی برہمن ہو گئے ؟"

مولوی صاحب تعلیم بالغان کے بڑے حامی ہیں۔ مولوی صاحب خود بیگم پورہ کے بالغان کو جمع کر کے شب میں تعلیم دیتے تھے۔ تعلیم کے لیے بالغوں کو جمع کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ دن بھر کے تھکے ماندے بڑی کوشش اور ترغیبوں سے جمع ہوتے ہیں مگر مولوی صاحب سے پڑھنے کے لیے کافی لوگ آجاتے تھے۔

مولوی صاحب مہتمم اور صدر مہتمم کی حیثیت سے بڑی پابندی سے دورہ کر کے مدرسوں کا معائنہ کرتے[1] اور مہتممانِ تعلیماتِ اضلاع کے دفتروں کی تنقیح بھی بڑی پابندی سے کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے معائنے اور تنقیح بہت ہمدردانہ ہوتی تھی۔ معائنوں میں مولوی صاحب زیادہ تر یہ دیکھتے کہ طلبا کی ذہنی اور اخلاقی ترقی کتنی ہوئی اور کتنا سبق طلبا نے صرف رٹ لیا ہے۔ چنانچہ طلبا سے سوالات ایسے کرتے کہ جن سے طلبا کے سوچنے اور سمجھنے کی قابلیت کا اندازہ ہوتا جماعتوں میں مُدرّسین کو سبق پڑھاتے ہوئے دیکھتے، جب یہ معلوم ہوتا کہ مدرّس کا طریقہ غلط ہے تو خود پڑھانے لگتے۔

مولوی صاحب کی ہدایات زیادہ تر زبانی ہوتی تھیں جن میں مدرّسوں کو بھی اپنے خیالات کے اظہار

---

[1] اس موقع پر مضمون نگار نے مولوی عبدالحق کے دورے کے چند لطیفے بیان کیے ہیں

کا موقع ملتا تھا۔ کتاب الرائے میں بہت کم مگر اصولی ہدایت درج کرتے تھے تاکہ جزوی طور سے مدرسین کو عمل کی آزادی حاصل رہے۔ عملی کامیابی کے لیے مقامی حالات کا تجربہ بہت ضروری ہوتا ہے۔ مولوی صاحب ان دشواریوں کو خوب سمجھتے تھے، اسی لیے اپنی ہدایات میں آزادیٔ عمل کی بہت گنجائش رکھتے تھے۔

مولوی صاحب مدرسین کی قدر و قیمت خوب جانتے تھے کیوں کہ یہ خود بھی مدرس رہ چکے تھے اس لیے ان کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ حکومت حیدرآباد نے تنظیمِ مدارس کے لیے مسٹر میہو ممالک متوسط ہندوستان کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کو مقرر کیا۔ انہوں نے جب صوبہ اورنگ آباد کا دورہ کیا تو مولوی صاحب کو بھی اُن کے ہمراہ رہنا پڑا۔ دونوں ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ وہاں لوکل بورڈ کا مدرسہ تھا۔ مدرس کی تنخواہ صرف پندرہ روپیہ تھی۔ مدرسہ اچھی حالت میں نہیں تھا۔ مسٹر میہو مدرسے ہی میں طلبا کے روبرو مدرس پر بہت خفا ہوئے۔ مولوی صاحب کو اُن کا یہ عمل بہت ناگوار ہوا۔ کیمپ پر آئے ملازمین کو سفر کی تیاری کا حکم دیا۔ مسٹر میہو کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ مولوی صاحب کے پاس آئے اور ترکِ ہمراہی کا سبب دریافت کیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں ایسے شخص کے ساتھ مدرسوں کا دورہ نہیں کرنا چاہتا جس کے دل میں مدرس کی عزت نہیں۔ آپ اس ریاست کی تعلیم کی تنظیم کیا خاک کریں گے۔ جب کہ آپ مدرس کی عظمت کو نہیں پہچانتے۔ یہ ایک غریب مدرس ہے مگر وہ قوم کے بچوں کو انسان بنا رہا ہے۔ مسٹر میہو نے بہت معذرت کی مگر مولوی صاحب نہ مانے اور مستقر پر چلے آئے۔

معائنہ مدرسہ کے بعد ایک جلسے میں مولوی صاحب نے صدر مدرس کی اہمیت پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم کو اچھے تعلقدار (کلکٹر)، قابل جج اور محکموں کے لائق افسر مل سکتے ہیں مگر موزوں صدر مدرس نہیں ملتا۔ ایسا شخص جس میں علمی قابلیت بھی ہو اور انتظامی صلاحیت بھی، جس کی طبعیت میں درشتی اور نرمی متوازی طور سے شریک ہو جو ماتحتوں کا خیرخواہ اور دل سوز رہنما ہو، جسے بچّوں سے محبت اور ملک کی ترقی کا احساس ہو، وہی صدر مدرس بن سکتا ہے۔ دفتروں کے افسروں کو ایسے مختلف النوع مسائل سے کہاں سابقہ پڑتا ہے جیسا کہ ایک صدر مدرس کو پڑتا ہے۔

جب مولوی صاحب انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل مقرر ہوئے تو سالانہ کالج ڈے

بڑے شاندار پیمانے پر مناتے تھے۔ ان تقریبوں کی یہ خصوصیت ہوتی تھی کہ ان کا پروگرام بڑے غور سے تیار کیا جاتا۔ مولوی صاحب کئی روز پہلے سے کالج میں اپنی سکونت اختیار کر لیتے تھے اور ہر کام کی بذات خود نگرانی کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولوی صاحب جس کام کو ہاتھ میں لیتے تھے اُسے بہترین طریقے پر انجام دیتے تھے۔ یہ "کالج ڈے" طلبا کے مشاہدے اور عملی تربیت کے لیے بہت مُفید ہوتے تھے۔

مولوی عبدالحق صاحب اپنے ماتحتوں کا بہت خیال کرتے تھے۔ اس کی تصدیق اُس خط سے ہوتی ہے جو صدر مہتمم تعلیمات اورنگ آباد سے پنشن پر سبکدوشی سے چند دن پہلے مولوی صاحب نے مضمون نگار کو لکھا۔ (مجلس، دکن، صفحہ ۱۴۳ – ۱۵۰)

ظن و تخمین

یک چراغیست	ڈاکٹر ذاکر حسین خاں
بقیۃ السلف	ڈاکٹر شوکت سبزواری
مسائلِ شخصیت	پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد
مولانا عبدالحق	ڈاکٹر غلام یزدانی
ڈاکٹر عبدالحق کی عظمت	ڈاکٹر سید رفیق حسین
مولوی عبدالحق ــ میرے تأثرات	پروفیسر عبدالقادر سروری
بابائے اُردو ــ ایک تأثر	ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی
مولوی عبدالحق ــ چند تأثرات	جگن ناتھ آزاد
عاشقِ اُردو	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
بابائے اُردو	ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی
اُردو کا معمارِ اعظم	حکیم اسرار احمد کریوی
اُردو کا زخمی سپاہی	سجّاد مرزا
اُردو کے بڑے میاں	وزیر حسن دہلوی
جواں ہمت بڈّھا	مرزا ادیب
اُردو کے دوسرے درویش کی کہانی	شاہد عشقی

بابائے اردو - طالب علموں کے لئے مثالی نمونہ!	حکیم اسرار احمد کریوی
مجاہدِ اردو	حکیم محمد امام امامی
بابائے اردو	سہیل عظیم آبادی
اردو تاریخ کے نئے موڑ پر	سید محمد تقی
مولوی عبدالحق، اردو، پاکستان!	رئیس امروہوی
ڈاکٹر مولوی عبدالحق	پروفیسر ہارون خاں شروانی
بابائے اردو	پروفیسر سید مبارز الدین رفعت
ڈاکٹر عبدالحق اور ان کی خدمات	محمد اکبر علی
مولوی عبدالحق	ضیاء الدین احمد برنی
مجددِ اردو	خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی
چند یادیں — چند تأثرات	ولایت علی بیگ
خدمتِ قوم اور مولوی عبدالحق	بہار کوٹی
مولوی عبدالحق - ایک تحریک ایک ادارہ	نظر حیدرآبادی
اردو اور بابائے اردو	شیخ عبدالعلیم خزاں
مولوی عبدالحق کی انشا پردازی کا نمونہ	مولانا سید ہاشمی فرید آبادی
مولوی عبدالحق کے چند خطوط	مولانا سید ہاشمی فرید آبادی

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں:

یک چراغیست!

قوموں کی زندگی میں زبان جو اہمیت رکھتی ہے، وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں یہی وہ سانچہ ہے جس میں خیال ڈھلتا ہے اور خیال ہی وہ مسالہ ہے جس سے سیرت کی تعمیر ہوتی ہے ہندوستان کی آزادی اور ترقی کے علم برداروں میں ایسے بہت کم تھے جنہوں نے اس راز کو سمجھا کہ سیاسی آزادی، ذہنی آزادی پر موقوف ہے اور ذہنی آزادی کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہمارے خیالات و جذبات کی ترجمان خود ہماری زبان ہو۔ اس مقصد کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے والا اور اس کے حصول کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دینے والا ایک ہی شخص نکلا —— مولوی عبدالحق!

اُردو زبان نے جو ہندوستان کے بہت بڑے حصّے کی زبان ہے اور سارے ملک کی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے پچھلے پچاس برس میں جتنی ترقی کی ہے، اُس میں مولوی عبدالحق صاحب کی کوششوں کو بہت کچھ دخل ہے۔ آج اُردو نہ صرف مشرقی علوم، بلکہ مغربی علوم وفنون سے بھی مالا مال ہے، اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہے اور ایشیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے اور یہ اُن تحریکوں کا نتیجہ ہے جن کی روح رواں مولوی صاحب کی ذات تھی۔ جامعہ عثمانیہ اور سررشتۂ تالیف و ترجمہ انہی کے خواب کی تعبیر اور انجمن ترقیٔ اُردو، اُنہی کے دست و بازو کی تعمیر ہے۔

مولوی صاحب نے نہ صرف اُردو کے حال کو استوار بنایا بلکہ اس کے مستقبل کو پائیدار بنانے میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی یعنی اُردو کی جو محبت، ان کے دل میں تھی اُس کی لگن لاکھوں دلوں میں لگا دی اور اس کا پیام سارے ہندوستان میں اِس سرے سے اُس سرے تک پہنچا دیا۔ اُن کی عُمر بھر کی محنت کا ثمرہ انجمن ترقیٔ اُردو، اب خدا کے فضل سے ایک جاندار اور جان بخش ادارہ ہے جو دہلی کے مرکز سے اپنی متعدد شاخوں کے ذریعے ملک کے ہر گوشے میں علم و ادب کی روشنی پھیلا رہا ہے:

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

(جوہر، صفحہ ۱)

ڈاکٹر شوکت سبزواری:

بقیۃُ السلف عبدُالحق

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صحیح معنی میں بقیۃُ السلف ہیں، اُن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ کیسے ہوا کرتے تھے۔ ادب، تنقید، تحقیق، تاریخ، لسانیات میں اُن کے تبحر کا کیا عالم تھا۔ وہ قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کا علم، ان کی ادبی بصیرت، فنی آگہی، لسانی مہارت، ہمیں اپنے بزرگوں کی صلاح و استعداد کی یاد دلاتی ہے۔ مولوی صاحب اس لحاظ سے ادیب، لُغوی اور ناقد ہیں کہ وہ ادب کے اُن تمام شعبوں میں مہارت رکھتے ہیں جن سے آگاہی ایک ادیب کے لیے ضروری ہے۔ انہوں نے اُردو کے قدیم و جدید ادب کا ناقدانہ مطالعہ کیا ہے۔ اُردو زبان کے ادا شناس ہیں اور زبان کی ماہیت سے آگاہ۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُردو الفاظ کس طرح بنتے ہیں، لفظوں کے صوتی آہنگ و ترتیب سے جادو کس طرح جگایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کے ساحرانہ اسلوبِ بیان کا اثر سب نے قبول کیا۔ اُن کے ساحرانہ ...... اسلوب کا راز ادب و زبان کے مسائل سے ان کی مُجتہدانہ آگاہی ہے۔ مولوی صاحب نے اوّل اوّل اُردو ادب کے قدیم دکنی شعرا کے کلام کو ترتیب دیا اور ان پر تحقیقی و تنقیدی مقدّمے لکھے۔ اُردو شعرا کے تذکرے جدید اصول ترتیب و تدوین کے مطابق شائع کیے۔ بعض شعرا پر تنقیدی مقالات لکھے اور اُن کے کلام کا انتخاب کیا۔ اُردو زبان کی پہلی اور آخری معیاری قواعد لکھی۔ جامع اور مکمل تاریخی لغت کی داغ بیل ڈالی۔ فنی و علمی اصطلاحات کے اُردو میں مناسب و برمحل ترجمے ہی نہیں کیے، ترجمے کے اُصول بنائے۔ اُردو تحریر میں اصلاحیں کیں، اوقاف کے ضابطے اور ان کی علامات مقرر فرمائیں۔ اپنے ہم عصروں کے جیتے جاگتے مرقع تیار کیے۔ یہ جامعیت کبھی اُردو کے کلاسیکی انشاپردازوں میں ہوا کرتی تھی۔ اب اس روایت کے سلسلے کی آخری کڑی مولوی عبدالحق صاحب ہیں۔

گزشتہ تین ماہ سے میں مولوی صاحب کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ لفظوں کی تحقیق، تاریخ، اُن کے گوناگوں معانی، اسناد، تحریر کے اصول و ضوابط، اوقاف، اصطلاحات اور ان کے مخففات، رموز و علامات اور اس قسم کے بے شمار دوسرے مسائل و مباحث آئے دن زیرِ بحث آتے ہیں۔ مولوی صاحب ہر مسئلے پر جو حاکمانہ فیصل رائے کا اظہار کرتے ہیں، اُسے سن کر اکثر دنگ رہ جاتا ہوں۔ مولوی صاحب کو بقول غالب ہر ادبی و لسانی مسئلے میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے۔ اس قسم کے دیدہ ور، صاحبِ نظر و خبر کہیں صدیوں میں جا کر بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔ (الشجاع، ص ۳۶ - ۳۷)

پروفیسر ابوظفر عبدالواحد:

پرنسپل اردو کالج، حیدر آباد دکن

مسائلی شخصیت مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق یکسر مسائلی انسان ہیں۔ اُن کی شخصیت بڑی بھرپور، پُر تنوع اور پیچیدہ ہے۔ وہ بیک آن ادیب، سیاس، اور انشا پرداز ہیں لیکن ہر رنگ میں ایک مثبت شخصیت کے مالک ہیں "محشرِ خیال" بھی ہیں اور اپنی ذات سے انجمن بھی اور پھر ہزاروں کے بیچ میں یک قلم تنہا بھی!

مسائلِ حیات سے انہیں گہری دل چسپی ہے اور مظاہرِ حیات اور مظاہرِ ادب سے اُنہیں عشق ہے، لیکن اُن کا عشق نہ بھنورے کا ہے جو "رس چوسے اُڑ جائے" اور نہ پروانے کا جو کسی شمع کے گرد طواف کرے اور جل مرے۔ اُن کے عشق کی شان عالمانہ یا پھر دیوتاؤں کی سی ہے جو انسانی مسرت و آلام کا دُور سے اور بظاہر بے تعلق رہ کر تماشہ دیکھا کرتے ہیں۔

زندگی کے حیاتیاتی (Biological) مسائل اور ادب کے تخلیقی کاروبار سے اُنہیں کبھی بہ طریقِ راست دل چسپی نہیں رہی۔ وہ سرسید کے دل دادہ اور حالی کے بڑے مدّاح ہیں۔ حالی کی نثر میں بلا کی متانت، سادگی اور زور ہے۔ یہ خصوصیات مولوی عبدالحق کی نثر میں بھی موجود ہیں بلکہ

کہنا چاہیئے کہ مولوی عبدالحق حالی کے تربیت یافتہ "ایڈیشن" اور نقشِ ثانی ہیں جس کو نقشِ اوّل پر ہر آئینہ برتری حاصل ہے، لیکن جوشِ تخلیق میں حالی اُن سے پار ہیں۔ حالی کا انکسار "اردو کے بابا" میں نہیں لیکن وہ حالی سے زیادہ پُرعزم اور باعمل انسان ہیں۔ حالی کی ملائمت بھی اُن میں نہیں، دُھن کے پکے دونوں ہیں لیکن دونوں کے طریقِ کار میں بڑا فرق ہے۔ حالی کی سرشت میں ملائمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے عبدالحق یکسر حالی تو نہ بن سکے، وہ خودسر حالی ہیں۔

جن حالات میں مولوی عبدالحق کو کام کرنا پڑا غالباً حالی کی ملائمت سے کام بھی نہ بنتا۔ حالی کا زمانہ کچھ اور تھا، عبدالحق کا کچھ اور۔ مولوی عبدالحق کو خودسری کے دَور سے سابقہ تھا جس سے خود فرنگی سامراج لرز رہا تھا۔ اس طرح حالی کی ادبیت، سیاست اور خودسری سے خالی ہے۔ عبدالحق کی ادبیت سیاست سے یکسر لیس ہے گو بظاہر سیاست سے اُنہیں چڑ ہے! عبدالحق نے زمانہ ہی ایسا پایا تھا کہ نری ادبیت جس میں سیاست شامل نہ ہو، یکسر ناکام ہو جاتی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ادب و زبان کے "پرچارک" کی حیثیت سے تخلیقی کاروبار سے انہیں دلچسپی نہیں رہی اور نہ اس کے پیچھے وقت ضائع کرنا اُنھوں نے قرینِ مصلحت سمجھا۔ مولوی عبدالحق بڑی رقم ہیں۔ وہ ایسے مُشَبّہ ہیں جو اپنے مشبہ بہ سے کہیں زیادہ سُہرتاسیانے اور باعمل ہیں۔ حالی کے وہ مدّاح سہی لیکن اُن کا ذہنی میلان سرسیّد کی طرف زیادہ ہے۔ وہی جوشِ عمل، وہی قوّتِ تنظیم اور وہی شیطانی توانائی! سرسیّد کے جانشینوں میں دو ہی ایسے ہیں جو سرسیّد کے حقیقی وارث کہلانے کے مستحق ہیں گو دونوں کے میدانِ عمل کسی قدر مختلف رہے ہیں۔ دونوں کے جوہر حیدرآباد میں کھلے اور چمکے، پھر دونوں نے حیدرآباد کو چھوڑ کر وسیع تر میدان کی تلاش میں لکھنؤ اور دہلی کو اپنا مستقر بنایا لیکن حالات کی ستم ظریفی نے دونوں کی محنت کو پھل ہونے نہ دیا۔ ندوۃ العلما کی ریشہ دوانیوں نے شبلی کو مارا اور ملک کی سیاسی تقسیم نے عبدالحق کو! عبدالحق کا اس میں قصور بھی کیا تھا۔ بہر حال وقت کی بیداد نے ایک مجاہد کو مہاجر بنا دیا۔ کیا عبدالحق کی اس ہار میں بھی ایک آن نہیں؟

(مجلس، دکن، ص ۸۸–۹۰)

پدما بھوشن ڈاکٹر غلام یزدانی :

سابق ناظم آثار قدیمہ، حیدرآباد دکن

مولانا عبدُالحق

اُردو مجلس حیدرآباد دکن کی جانب سے ۲۹ مئی ۱۹۶۰ء کو یوم مولوی عبدالحق منایا گیا۔ اس موقع پر غلام یزدانی صاحب نے جو تقریر فرمائی اس کا متن دیا گیا ہے۔ موصوف نے فرمایا ہے کہ میں مولانا کو ۶۴ برس سے جانتا ہوں۔ مولانا کا تبحّرِ علمی، صحیح ذوق اور تلاش و تحقیق کا شوق ایسی صفات تھیں جن کا میں شروع ہی سے گرویدہ ہو گیا۔ محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" کی تنقید کو وہ بہت رسمی اور پُرانے تذکرہ نویسوں کی "آوازِ بازگشت" خیال کرتے رہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے سلسلے میں دارالترجمہ کا قیام، ماہرین کو جمع کرنا اور پھر اُن سے تمام علوم کی کتابوں کا ترجمہ، ایک بلند معیار پر کرانا، اُن کا بڑا کارنامہ ہے۔

اُن کا مشرب بہت وسیع اور مذہب انسانیت ہے، اس کی وجہ سے اُن کے حلقۂ احباب میں نور خاں (گُدڑی کا لال) مقبرے کا بوڑھا مالی، الف خاں رانگھڑ (راجپوت) داروغۂ جیل، نواب عماد الملک سر اکبر حیدری، ترک پاشا اور اب صدر محمد ایوب خاں یکساں شامل رہے۔

مولانا عبدالحق کے فیضانِ صحبت نے بہت سے ادیب، شاعر اور مؤرخ پیدا کر دیئے مثلاً شیخ چاند مرحوم، سکندر علی وجد، اور ہاشمی فرید آبادی۔ (مجلس، دکن، ص ۱۴-۱۵)

ڈاکٹر سید رفیق حسین :

ڈاکٹر عبدالحق کی عظمت

بڑا انشاء پرداز بھی عہد آفریں ہوتا ہے وہ اپنے فن اور اسلوب سے نہ صرف اپنے معاصرین کو بلکہ نوخیز اور جواں عمر ادیبوں کو بھی متاثر کرتا ہے۔ حالی اور شبلی کے بعد اردو نثر کا میدان خالی نظر آرہا تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق صحیح معنوں میں ان کے جانشیں ہوئے اور بہت سے وہ کام جو یہ دونوں نہ کر سکے تھے، موصوف نے انجام دیئے۔ اچھی نثر بھی لکھی، اپنے رفقاء کار بھی پیدا کیے اور ان سب سے بڑھ کر انھوں نے نوجوانوں میں اردو کو علم و فن کی حیثیت سے جاننے، پڑھنے اور ترقی دینے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ یہ کام اتنا مشکل تھا کہ ان سے پہلے کوئی دوسرا انجام نہ دے سکا تھا اور انجام دینا کیا معنی، اس کی طرف کسی نے کوئی خاص توجہ بھی نہیں کی تھی۔

وہ نوجوانوں کو ترغیبِ علم و ادب دیا کرتے ہیں اور صرف ان کے دلوں میں ذوق و شوق پیدا کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہر موقع پر اور ہر محل پر اُن کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ یہ بے لوث، بے غرض اور منصفانہ ہوتی ہے۔ اس میں مبالغے کا شائبہ نہیں ہوتا۔ انھوں نے سینکڑوں نوجوان ادیبوں کے دل بڑھائے ہیں، اُن کی ذہنی تربیت کی ہے، اُنھیں اچھا خاصہ ادیب بنا دیا ہے۔ صرف یہی نہیں، بھٹکتے ہوئے نوجوانوں کو سیدھے راستے پر لگانے کی کوشش بھی کی ہے اُن کی ایسی چھوٹی موٹی خدمتوں میں شانِ دلربائی نہ سہی لیکن ان کے پس پشت ایسی شفقت اور ایسا خلوص ہے کہ جسے آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔

وہ تنقید و تحقیق کے امام اِس لیے نہیں کہ اُن سے بڑھ کر کوئی محقق ہی نہیں یا اُن سے اچھا کوئی نقاد نہیں ہو سکتا بلکہ تنقید و تحقیق کے پیشوا وہ اسی لیے ہیں کہ اُن سے پہلے صحیح معنوں میں تنقید و تحقیق کی ابتدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی تلاش و کوشش سے تحقیق و تدقیق کا کام آگے بڑھا اور صحیح واقعات کا

علم ہوا۔ پرانے تذکروں کی اشاعت، اُردو کے لیے بڑا بنیادی کام تھا جو انھوں نے کیا پھر ان تذکروں پر بصیرت افروز مقدمے بھی لکھے۔

قدیم کاملینِ فن کی اَدا یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی معلومات کو عام نہ کرتے تھے، پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے کا بہانہ کرتے تھے، نتیجتاً اُن کی بیش بہا معلومات علم سینہ ہو کر رہ جاتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اِس روش کو ترک کر دیا۔ انہیں جو کچھ معلوم ہو سکا اور جب معلوم ہوا اُسے فوراً دنیائے علم و ادب کے لیے عام کیا۔ واقعاتی تحقیق اُن کا خاص موضوع ہے۔ تحقیق کو مولانا بحرِ ناپیدا کنار تصوّر کرتے ہیں جس میں حرفِ آخر کی کوئی گنجائش نہیں۔ اَدبی تحقیق کے علاوہ اُردو تنقید کی طرف بھی مولانائے موصوف نے توجہ کی اور حق یہ ہے کہ خوب کی۔ اُن کے تنقیدی فن کا طُرّہ امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی توجیہات میں جذبات سے زیادہ عقل سے کام لیتے ہیں۔ اُن کے دلائل معقول اور مُناسب ہوتے ہیں۔

مولانا کے اسلوبِ بیان میں نرالے پن اور انوکھے پن کی کوئی نشانی نہیں ملتی۔ اسے رنگین بھی نہیں کہا جا سکتا اور دقیق ہونے کا اطلاق بھی اس پر نہیں ہوتا لیکن اسے صرف سادہ اور سلیس کہنا بڑی بے انصافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن سے پہلے ایسا اسلوب کسی کا نہیں تھا، اور یہ ایسا ہے کہ جسے ہم بڑی آسانی سے فطری کہہ سکتے ہیں یہی وہ اسلوب ہے جو عوام میں پسند کیا جا سکتا ہے اور سمجھا جا سکتا ہے۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔ یہی وہ طرزِ بیان ہے جس سے تعلیم عام کی جاتی ہے۔ یہ وہ عبارت ہے جس کی جامہ زیبی صرف حقیقت اور صداقت سے پیدا کی جا سکتی ہے تکمیلِ مقصد کے لیے اور منزلِ مراد پر پہنچنے کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسرا اسلوب نہیں ہو سکتا۔

قواعدِ اُردو، انگریزی اُردو لغت کی ترتیب و تسوید، املا کی اصلاح، وضع اصطلاحات، اُردو ٹائپ میں اصلاح کی آواز — اُن کے بنیادی کام ہیں جن کی بنا پر اُردو میں تقویت اور توانائی آئی اور زبان، ترقی کی راہ پر لگی۔

اُنہوں نے حتی الامکان یہ کوشش بھی کی کہ زبان کا مسئلہ لیڈروں کے ہاتھ میں کھلونا نہ بنے۔ اُن کا مقصد بھی بلند رہا اور اس کے حصول کے وسائل بھی اچھے اور بلند رہے — اتحاد اور یگانگت کی وہ برابر

کوشش کرتے رہے۔ اپنے کردار کی پاکیزگی اور علو مقصدی کی وجہ سے وہ اپنوں، پراؤں، دونوں میں مقبول رہے۔ گاندھی کی خدمت میں بھی باریاب تھے اور بارگاہِ قائدِ اعظم میں بھی۔ دونوں بزرگ ان کی عزت کرتے تھے۔ اُن کے دوستوں میں ہر قوم و ملت کے افراد پائے جاتے ہیں۔ (الشجاع، ص ۴۶-۵۰)

پروفیسر عبدالقادر سروری:

مولوی عبدالحق — میرے تاثرات

یہ مضمون، اُردو مجلس، حیدرآباد (دکن) کی طرف سے منائے گئے "یوم مولوی عبدالحق" کے موقع پر ۲۹ مئی ۱۹۶۱ء کو پڑھا گیا۔ مضمون میں، مولوی صاحب سے اپنے تعلق، ان کی ذات اور مساعی کا تحسینی کلمات میں ذکر کیا گیا ہے:

اُردو کے خدمت گزاروں میں مولوی عبدالحق صاحب کی ہستی، ایک نہایت مغتنم ہستی ہے۔ اُردو اُن کے جگر گوشے کی طرح ہے۔ اپنی شعوری حیات کا سارا حصہ انھوں نے اسی کے پالن پوس کے لیے وقف کر دیا ہے۔

جامعہ عثمانیہ میں اُن کی پروفیسری بڑی طنطنہ کی تھی وہ ہفتہ میں پانچ چھ گھنٹوں سے زیادہ درس نہیں دیتے تھے اور درس بھی جامعہ کی عمارت کی بجائے اکثر باغِ عامہ میں سبزہ زار پر بیٹھ کر دیا کرتے تھے حیدرآباد آنے کے بعد مولوی صاحب نے کچھ دن شہر میں قیام کیا، اس کے بعد انھیں بنجارہ ہل (موجودہ حویلی) پر تنہائی میں آبادی سے کوسوں دور مکان مل گیا۔ انھیں شہر میں رہنا پسند نہیں تھا۔ ان کی بلند حوصلگی بلندی چاہتی تھی وہ صحبت سے دور بھاگتے دکھائی دیتے۔ سوائے اپنے مخصوص احباب کے لوگوں سے انھیں ملنا پسند نہیں تھا؛ خاص طور پر حیدرآباد کے لوگوں سے۔ مولوی صاحب کا کردار جیسا ممیز ہے ان کی پسند و ناپسند

بھی اتنی ہی شدید ہے جب وہ کسی کو ناپسند کرتے تو پھر کوئی طاقت انہیں اس کا موافق نہیں بنا سکتی تھی۔

بنجارہ ہل کی اُجڑی نگری میں، وہ تنہا کوئی سات، آٹھ برس رہے بعض موقعوں پر کچھ مہمان آکر ٹھہر جاتے ڈاکٹر یوسف خاں، ڈاکٹر اختر رائے پوری، پروفیسر حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، بہ اوقات مختلفہ ان کے یہاں مہمان رہے۔ مولوی صاحب کے علاوہ اس گھر میں ان کا چہیتا ملازم شیرو اور اس کا خاندان رہتا تھا۔ شیرو ان کا خانساماں تھا، ان کا ڈرائیور تھا، ان کا پرسنل سکریٹری، غرض سب کچھ تھا۔ سفر و حضر ہر جگہ وہ عموماً اُن کے ساتھ رہتا۔

مولوی صاحب صبح اور شام ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا لیے چہل قدمی کو نکلتے تھے چہل قدمی تو ایک اصطلاح ہے ان کے سپاٹے "ہزار قدمی" سے بھی زیادہ کے ہوتے تھے اور ایک وقت میں چار چار، پانچ پانچ میل کی مسافت طے کرنا ان کے لیے معمولی بات تھی۔

مولوی صاحب کے قابلِ قدر ادبی کارناموں میں اُن کی اُردوئے قدیم کی تحقیقات اور "قواعدِ اردو" ایسے کارنامے ہیں جن کی اہمیت کبھی گھٹ نہیں سکتی۔ (مجلس، دکن، ص ۵۳–۵۷)

ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی:

بابائے اُردو — ایک تأثر

بابائے اُردو نے سوچ سمجھ کر ایک نصب العین کو اپنایا اور ایک عوامی زبان کو "زبان" دے دی کہ میں عمر بھر تیرا وفادار رہوں گا۔ "استوار وفاداری" کا یہ عہد ان کی زندگی کا حریف بن گیا۔ جس راستے پر انہوں نے قدم رکھا وہ بڑا پُرپیچ، سنگلاخ، کٹھن اور دشوار گزار نکلا۔ اس "پیکرِ خلوص" نے اس راہ میں بڑی اذیتیں اُٹھائیں لیکن ان کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ اُن کے ہاتھ میں "سچی لگن" کی مشعل ہے

اُن کی زبان پر صرف اُردو کی داستان ہے، اُس کے شب و روز کی ہر ساعت اُردو کی خدمت میں گزرتی ہے اور "مقدس وعدہ" کو لیے وہ پامردی کے ساتھ پچاس برس سے سرگرم سفر ہیں، ایک مقصد، ایک لگن، ایک آرزو اور ایک نصب العین کی خاطر اتنا طویل راستہ طے کرنا، اپنوں کو غیرت دلانا، غیروں کی ہمدردی حاصل کرنا، دوستوں سے شکوہ کرنا، دشمنوں سے مقابلہ کرنا، اپنے محبوب مشغلے کی خاطر دن رات کی تمیز مٹا دینا، طویل العمری میں بھی اپنے ارادے میں اٹل رہنا ایک بڑی بات بلکہ بہت بڑی بات ہے — اس لیے عبدالحق کی کہانی، ایک انسان کی کہانی نہیں بلکہ بے پناہ عزم و ارادہ کی کہانی ہے، بے پناہ خلوص و یقین اور بہت اونچی اقدار کی کہانی ہے!

مولوی عبدالحق نے اُردو زبان سے بے لاگ محبت کی، تحقیق و تنقید سے اسے مالا مال کیا، اس کی آبیاری کی، اسے سر سبز ہونے کی صلاحیت بخشی اس میں صالح اقدار کو سمونے کی کوشش کی اس کی کونپلوں کو تازگی بخشی، اسے بادِ سموم سے بچا لیا، اس کے پھلنے پھولنے کا ہر امکانی سامان فراہم کیا — اُردو زبان کی ترقی و تہذیب ہمیشہ اُن کا مطمع نظر رہا۔ انھوں نے وسعت قلب کے ساتھ زمانے کے نئے تقاضوں کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔ وہ نوجوانوں سے بڑی محبت کرتے ہیں اُن کے نئے نئے تجربات کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کے نظریاتِ حیات کو اس انہماک سے سنتے ہیں کہ اپنی پیرانہ سالی بھول جاتے ہیں۔ وہ دراصل "قدیم و جدید" کو ہم آہنگ اور متوازن کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اُردو کو جینے کا حق دلانا چاہتے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں اس سے توانائی حاصل کر سکیں۔ (مجلس، دکن، ص ۶۵ — ۶۸)

جگن ناتھ آزاد:

مولوی عبدالحق — چند تاثّرات

مولوی عبدالحق سے اپنے تعلقِ خاطر اور چند ملاقاتوں کا سیدھے سادے انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔
(مجلس، دکن، ص ۱۶۵ — ۱۶۹)

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی:

عاشقِ اُردو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا اُردو سے عشق، اُس لگن کی تابندہ مثال ہے جو کسی شخص کو اپنی مادری زبان سے ہو سکتی ہے — مَیں مولوی صاحب کی محنت اور قابلیت کا اُسی وقت مُعترف ہو گیا تھا جب میں علی گڑھ میں اُردو ایم۔ اے کا طالب علم تھا۔ ۱۹۴۴ء میں جب مَیں اینگلو عربک کالج (دلّی کالج) میں بحیثیت مُعلّم مقرّر ہُوا تو اکثر مولوی صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

دلّی کالج میں مُعلّمی مجھے کیوں کر ملی اس کا واقعہ بھی ذرا دلچسپ ہے۔ ۱۹۴۳ء کے آخر میں "انجمن ترقّیِ اُردو" کے دفتر میں وہ تمام لوگ انٹرویو کے لیے بُلائے گئے جنہوں نے اس جگہ کے لیے درخواست دی تھی۔ انٹرویو لینے کے لیے دس بارہ مقتدر حضرات موجود تھے۔ صدارت مولوی صاحب کر رہے تھے۔ جب میں انٹرویو کے لیے پیش ہُوا تو اُردو ادب کے متعلق سوال و جواب مولوی صاحب ہی سے ہُوئے۔ ایک سوال کے جواب میں مجھے مولوی صاحب سے اختلاف ہُوا اور میں نے اپنے اختلاف کا اظہار کچھ انداز سے کیا کہ مَیں نے محسوس کیا دوسرے حضرات میری اِس جسارت کو اچھّی نظروں سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ انٹرویو ختم ہُوا اور مَیں اُسی دن اپنے وطن واپس روانہ ہو گیا، یہ سوچ کر کہ جب مولوی صاحب ہی سے بھِڑ گیا اور دوسرے حضرات بھی غالباً مجھے بدتمیز ہی سمجھ رہے ہیں تو اب اس اسامی پر میری تقرّری کا کیا امکان؟ مہینا بھر کے بعد مجھے اپنے وطن میں تقرّر کا پروانہ ملا۔ دلّی پہنچ کر معلوم ہُوا کہ واقعی دیگر حضرات میرے اندازِ گفتگو سے خوش نہ تھے لیکن خود مولوی صاحب نے میرے تقرّر کی تائید یہ کہہ کر کی تھی کہ کم از کم یہ شخص اپنی ایک رائے تو رکھتا ہے۔ مَیں دلّی کالج میں جنوری ۱۹۴۵ء تک رہا۔ شام کو اکثر مولوی صاحب کے ہاں چلا جاتا تھا۔

مولوی صاحب ایک مشین کی طرح کام کرتے نظر آتے تھے۔ صبح چار بجے، چائے ناشتے کے بعد جو میز پر بیٹھے تو سہ پہر کے چار بجے اُٹھتے تھے۔ دن کے کھانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا کیونکہ مولوی صاحب ہمیشہ سے ایک وقت کھانے کے عادی رہے ہیں۔ ایک دن مولوی صاحب سے پوچھ بیٹھا کہ آپ ایک وقت کھانے پر کیونکہ بغیر تھکے اتنا کام کر لیتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ بھئی یہ چار چار وقت کھانے کی روایت تو انگریزوں نے قائم کی ہے ورنہ کم خوری تو ہم لوگوں کی پُرانی روایت رہی ہے۔ آدمی جتنا زیادہ کھائے گا، اُس کے معدے کو زیادہ کام کرنا پڑے گا، اس لیے لازمی طور پر دماغ میں کسل پیدا ہو جائے گا۔ مولوی صاحب نے اپنی تندرستی کا ایک راز یہ بھی بتایا کہ وہ ہمیشہ صبح کو ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہیں اور کبھی کمرے کے اندر نہیں سوتے، خواہ کڑاکے کے جاڑے ہوں اور برف ہی کیوں نہ پڑ رہی ہو۔

(نورس، کراچی، ص ۹۲ — ۹۵)

ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی:

بابائے اُردو

"مَیں آج تک بابائے اُردو سے شرفِ نیاز حاصل نہ کر سکی، درکبھی اُن کی آواز تک نہیں سُنی لیکن ذہنی طور پر مَیں ایک باقاعدہ و باعقیدہ شاگرد ہوں — ۱۹۵۱ء میں "چند ہم عصر" میری نظر سے گزری اس کے مطالعے سے "ایک انوکھا احساس، نامعلوم مسرت اور توانا وقار" مجھے ملا۔ پھر میں نے مولوی صاحب کی سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ میں نے بابا کی غیر مجلد و تحریروں کا ذخیرہ کرنا شروع کر دیا اور ہر ممکنہ تلاش میں مصروف ہو گئی۔

جب میں نے بہت کچھ فراہم کر لیا تو اُن کی تحریروں کو بار بار پڑھا اور ان کے پس منظر کو تلاش کیا۔ انجمن ترقی اُردو کی طویل اور مسلسل کہانی کو تحریر میں لائی اور اتنا سرمایہ جمع ہو گیا تھا کہ اسے شائع کر دوں۔

ہوا بھی یہی اور مَیں نے اسے کتابی صورت دے دی۔ خدا بھلا کرے کراچی کے اُس ناشر کا جس نے یکے بعد دیگرے میرے دونوں فائل ہضم کر لیے اور اس کی پرچھائیں تک نہ دکھائی۔

مولوی صاحب کی تحریروں سے مجھے کیا ملا؟ زندگی کا برتنا اور اس کے تمام پہلوؤں سے متاثر ہونا، نیز:

١۔ وہ جن کے ارادے جوان ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ جوان رہتے ہیں۔

٢۔ وہ جن کی روح جوان رہتی ہے، ان کا جذبۂ عمل کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

٣۔ اُردو نے مولوی صاحب کو جوان بنا دیا اور مولوی صاحب نے اُردو کو بچے سے جوان کر دیا ہے۔

یہی وہ احساسات ہیں جن سے متاثر ہو کر میں نے ایک کتاب "بابائے اُردو" لکھی تھی۔

O

"مقدماتِ عبدالحق"، کا میں نے گہرا مطالعہ کیا تو ذہن کو ایک بلندی عطا ہوئی۔ یہ مقدمات ادب کے اعلیٰ شاہکار ہیں۔ ہر مقدمے کی نوعیت اور ڈھب جُدا جُدا ہے۔

امریکہ کے مشہور مصنف Dr. Draper کی کتاب "Conflict Between Religion + Science") کا ترجمہ مولوی ظفر علی خاں نے "معرکۂ مذہب و سائنس" کے نام سے کیا تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس پر اسّی صفحات کا ایک مقدمہ لکھا۔ مقدمہ کیا ہے علمی مسائل کا ایک سمندر ہے جس میں ہر بحث موج بن کر اٹھتی ہے اور ہر دلیل اُسے کنارے تک پہنچا کر دم لیتی ہے۔ یہ معرکۃ الآرا تحریر مدلل بھی ہے اور مؤثر بھی۔

مولوی صاحب کے کارناموں میں سب سے گھمبیر کارنامہ "انجمن ترقی اُردو" ہے جس کی کہانی طویل، مؤثر اور سبق آموز ہے جس کے پڑھنے سے طوفان میں گھری ہوئی چٹانوں کا سا عزم پیدا ہو جاتا ہے اور ایک عظیم ہستی کے نقشِ پا پر چلنے کا جوش اُبل پڑتا ہے۔

(الشجاع، ص ١٠٠–١٠٢)

حکیم اسرار احمد کریوی :

اُردو کا معمارِ اعظم

مولوی عبدالحق صاحب نے پچھلی صدی میں اُردو کے لیے جو پاپڑ بیلے ہیں حکیم صاحب نے بالاختصار اُن کا حصار کرنے کے علاوہ اس مضمون میں مولوی صاحب کے مزاج اور سوانح کی طرف بھی اشارہ کیا ہے آخر میں مولوی صاحب کی چند اہم تالیفات کی فہرست بھی پیش کر دی ہے :

سرسید احمد خاں کی طرح مولوی صاحب اسلاف کے کارناموں کا اعتراف ہی نہیں اُن پر فخر کرتے ہیں لیکن نئے خیالات کا خیر مقدم کرنے کے لیے بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں، ساتھ ہی وہ سرسید کی طرح بعض غلط کار اور غیر معتدل جدت پرستوں کی طرح اس بات کے قائل نہیں کہ ہر پُرانی چیز کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔

اُردو میں سرسید نے سنجیدہ، علمی خیالات کو ادا کرنے کے لیے جو انداز اختیار کیا، حالی نے اُسے نکھارا اور آخر میں مولوی عبدالحق نے اسے معراجِ کمال کو پہنچایا۔ وہ اُردو زبان کی صحیح روح سے آشنا ہیں ان کی انشاپردازی کے اثرات پچھلے تیس چالیس برس سے اُردو زبان و ادب پر اس طرح مسلط ہیں کہ برِ عظیم کا کوئی ادب اس کی پیروی اور خوشہ چینی سے اپنے دامن کو بمشکل ہی بچا سکتا ہے۔ کسی ادیب اور انشاپرداز کو زندگی میں یہ مرتبہ بہت کم نصیب ہوتا ہے۔

علی گڑھ سے مولوی صاحب حیدر آباد تشریف لے گئے اور ان کے صحیح جوہر یہیں کھلے ۱۹۱۲ء میں "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے بے جان شعبۂ اُردو کے سیکرٹری کا اعزازی عہدہ سنبھالا اور اس میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ انہوں نے علمی اور تحقیقی کتابیں خود لکھیں، دوسروں سے لکھوائیں اور انجمن سے شائع کیں۔ مولوی صاحب کے مرتب کردہ قدیم دکھنی مخطوطات اور نادر اردو تذکرے

کی اشاعت سے اُردو کی عمر میں کئی سو سال کا اضافہ ہو گیا۔ یہ ایک ایسا بڑا اور عظیم الشان کارنامہ ہے، جس کے احسان سے آنے والی نسلیں بھی آسانی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۸ء تک کا زمانہ اُن کی زندگی کا بڑا طوفانی دور تھا۔ انھوں نے بار بار ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا اور جہاں جہاں ضرورت ہوئی اُردو کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ انھوں نے انجمن کی طرف سے کئی سو معیاری کتابیں شائع کیں انہیں کی توجہ اور کوشش سے پہلی مرتبہ اُردو زبان میں روسی ادب پر دو جلدوں میں ایک ضخیم کتاب طبع کی گئی۔ مشہور روسی ادیب میکسیم گورکی کی خود نوشت سوانح حیات کا اردو ترجمہ بھی مولوی صاحب کی تحریک سے انجمن کی طرف سے شائع کیا گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب کی زندگی سرتاپا عمل ہے اور ان میں اپنے مقصد سے غیر معمولی خلوص ہے ہماری سوسائٹی میں مولوی صاحب کی ذات کے سوا کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی جس نے ایک نیک مقصد کے لیے اپنی عمر کے پچاس سال بے غرضی سے صرف کر دیئے ہوں۔

(مجلس، دکن، ص ۵۸ — ۶۴)

سجاد مرزا :
سابق معتمد تعلیمات، حکومت حیدر آباد دکن

اُردو کا زخمی سپاہی

مختصر تاثراتی مضمون ہے جس میں بابائے اُردو کی مختلف خدمتوں کے سرسری ذکر اور اُن سے نومبر ۱۹۵۹ء میں اپنی ایک ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

مولوی صاحب ایک سپاہی ہیں جو اُردو زبان کی نصف صدی کی خدمت میں بار ہا زخمی ہو چکے ہیں اُن کو گھائل کرنے میں اُردو دشمنوں سے زیادہ اُن اشخاص نے حصّہ لیا ہے جو اُردو داں ہیں اور ان میں بھی اکثر وہ، جنہوں نے مولوی صاحب کی نظرِ عنایت کی بدولت اپنی علمی اور معاشی زندگی سُدھاری ہے۔ اُردو زبان کا یہ سپاہی اپنی پچاس سالہ جنگ میں بُری طرح مجروح ہو چکا ہے لیکن اس کی ہمت اور اس کے

استقلال میں بال برابر فرق نہیں آیا۔ (مجلس، دکن، ص)

وزیر حسن دھاوی:

اُردو کے بڑے میاں

ایک ہیں "بڑے میاں" ایک ہیں "بڑی بی" جیسے جیسے یہ دونوں بوڑھے ہو رہے ہیں، ویسے ویسے محبت فزا رہے ہیں۔ کروڑہا دلوں کو ہم دل وہم زبان بنا رہے ہیں!

ڈاکٹر صاحب لفظ لفظ جادو جگایا کرتے ہیں، جیسے ڈاکٹر صاحب، ویسا اُن کا اسٹائل، موہن معقول، تبسم! (مجلس، دکن، ص ۱۷۰-۱۷۴)

مرزا ادیب:

جواں ہمّت بڈّھا

ایک اُصول کی خاطر اپنا تن من دھن وقف کر دینا کوئی ایسی بات نہیں جس کا مشاہدہ روزمرہ کی زندگی میں کیا جا سکے۔ ایسا صاحب ہمت تو صدیوں میں کہیں جا کر پیدا ہوتا ہے جو سوئے تو ایک ہی چیز کا خواب دیکھے اور جاگے تو اسی خواب کو عملی شکل دینے کے لیے اپنی تمام تر امکانی صلاحیتیں صرف کر ڈالے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی طویل زندگی اُردو کے فروغ کے لیے کچھ اس طرح گزار دی ہے کہ آج عبدالحق اور اُردو، دو الگ الگ وجود نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک تنہا ہستی بن گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اُردو کے لیے کیا کچھ کیا؟ وہی کچھ جو ایک انسان اپنی عزیز ترین شے کے لیے کر سکتا

ہے ۔ ذہن کی ساری اہلیتیں اس کے لیے مخصوص کر دیں ، اپنی ساری جد وجہد کو صرف اسی رُخ پر لگا دیا صرف اسی مقصد کی خاطر اپنے دنوں کا آرام اور اپنی راتوں کی نیند حرام کر لی اور اپنا سارا اثاثہ اس پر نچھاور کر دیا۔

نمودِ پاکستان سے پیشتر اُردو پر ایک بڑا کٹھن وقت آیا تھا ۔ وہ زمانہ سخت ابتلا کا زمانہ تھا۔ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی الفوا ہندی کا ایک ایسا چکر چلایا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ، شاید اب اُردو کے لیے نزع کے لمحے آ پہنچے ہیں ۔ اُس وقت بڈھے کی گرج ایک آتشیں شعلے کی طرح اندھیروں کا سینہ چیر کر ہر طرف پھیل گئی ۔ اس وقت نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر اُردو کی حفاظت کے لیے جہد آزما ہو جانا ایک صبر آزما مرحلہ تھا ۔ اور مولوی عبدالحق کا قدم ایک لمحے کے لیے بھی نہ رُکا ، برابر آگے بڑھتا گیا۔ عبدالحق نے اُردو کی خاطر غیروں کا مردانہ وار مقابلہ کیا ، مگر دُکھ دینے والی اور بہت زیادہ دُکھ دینے والی بات یہ ہے کہ آج وہ اپنوں ہی کے سب سے قیمتی ورثے کے لیے اپنوں ہی کا مقابلہ کر رہا ہے —

(الشجاع ، ص ، ۵۵ - ۵۷)

شاہد عشقی :

اُردو کے دوسرے درویش کی کہانی

ادب میں حالی کی سی درویشانہ کسرِ نفسی ، سادگی ، استغنا اور بے لوث خدمت حالی کے بعد عبدالحق کے حصے میں آئی ۔ مولوی صاحب کی مستقل تصانیف زیادہ نہیں ، یہی ان کے درویشانہ استغنا کو ظاہر کرتا ہے اور حالی کی جانشینی کا حق ادا کرتا ہے ورنہ پچھلی صدی میں اُردو زبان سے متعلق تمام تر علمی تحقیقات بالواسطہ یا بلا واسطہ مولانا کی ذات سے متعلق رہی ہیں ۔ اُن کے خطبات ، ان کے مقدمات ، ان کے خطوط ، ان کی روزمرہ گفتگو ، ایسے نکات و اشارات سے پُر ہے ، جنھوں نے اَن گنت مستقل تصانیف

کو جنم دیا۔

کالج کی تعلیم کے بعد انھوں نے عربی ادب، صرف ونحو، ہندی زبان وادب، دکنی اور گجراتی اردو (گجری) میں مزید دسترس حاصل کی۔ اورنگ آباد میں ایک پنڈت کی مدد سے تلسی داس کی رامائن پڑھی اور زنگارنگ علمی امانتوں نے، جو ان کے سینے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئیں تھیں ان کے مزاج میں عجب تنوع اور شگفتگی پیدا کر دی۔ مولانا عبدالحق کی غالباً سب سے اہم، کامیاب اور خاموش کوشش جامعہ عثمانیہ کا قیام تھا۔ ان کی تحقیق وتنقید، مقدمات وتبصرات کو اگر ان سے علاحدہ کرلیا جائے تب بھی ترقی اردو کے سلسلے میں ان کی کوششیں بہت گراں مایہ ہیں۔ حالی نے اپنے استاد غالب کو حیوان ظریف کہا ہے۔ کچھ لوگ اس ترکیب کا اطلاق شاگردِ حالی پر بھی کرتے ہیں لیکن مولانا عبدالحق کے یہاں طنز وتمسخر نہیں صرف زیرِ لب مسکراہٹ ملتی ہے۔ یہ مسکراہٹیں ان کے خطبوں میں نکھری ہوئی ہیں، ان کے مقدمات میں بکھری ہوئی ہیں، ان کے خطوط میں نمایاں ہیں، ان کی گفتگو میں جھلکتی ہیں۔ گاندھی نے رسالہ "ہنس" کی مشکل ہندی کو معیاری ہندوستانی کہا تو مولانا عبدالحق نے کہا: "ایسی بڑی جسارت، ایسا ہی بڑا آدمی کر سکتا ہے۔" ایک بار الہ آباد اور لکھنؤ کی یونیورسٹی کے دو پروفیسر صاحبان اپنی اپنی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے گن گا رہے تھے کہ مولانا نے مسکراتے ہوئے فیصلہ کر دیا کہ "الہ آباد یونیورسٹی اردو کا قبرستان ہے اور لکھنو امام باڑہ۔" یہ ظرافت بغیر شعوری کوشش کے ان کے لب ولہجے میں رچ سی گئی ہے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ سرسید حالی اور شبلی کے دور کے عبدالحق آج ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ان کے وجود کو مناسب اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔ ہر چمکتی ہوئی شے کو سونا سمجھ لیتے ہیں اور گدڑی میں لعل کا تصور نہیں کرسکتے اور لعل ہمیشہ گدڑی میں ہوتے ہیں۔ اردو ادب کا یہ درویش آج بھی اپنے وجود کو گدڑی میں چھپائے ہوئے ہے۔ اردو کے ہر شیدائی کو وہ آج بھی احترام سے دیکھتا ہے اور علم کے ہر پرستار کی وہ آج بھی عزت کرتا ہے۔ اس نے ہمیشہ دوسروں کو آگے بڑھایا اور خود چھپا رہا۔ (الشجاع، ص ۳۰-۳۵)

حکیم اسرار احمد کریوی :

بابائے اُردو : طالب علموں کے لیے مثالی نمونہ

اُردو کے علاوہ بھی دنیا میں زبانیں ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر ترقی یافتہ، لیکن آج تک کسی زبان کے ادیب، انشاپرداز اور مصنف کو یہ اعزاز نصیب نہیں ہوا کہ اس کے ہم عصروں نے اسے اُس زبان کا "بابا" کہا ہو۔ مولوی صاحب کو "بابائے اُردو" کا خطاب دربار سرکار سے نہیں ملا اور نہ اُنہیں یہ خطاب پیش کرنے کے سلسلے میں پہلے سے کوئی منصوبہ بنایا گیا تھا۔ یہ اورنگ آباد کے ایک طالب علم کے دل سے نکلی ہوئی سچّی آواز تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے برّعظیم کے کروڑوں اُردو بولنے والوں کی زبان پر چڑھ گئی۔ ہم مشرقی لوگوں کی سیرت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اپنے بڑے آدمیوں کی اُن کی زندگی میں کوئی قدر نہیں کرتے، لیکن جہاں اُنھوں نے اس دنیا سے کنارا کیا، پھر ہمارے حُسنِ عقیدت کا کیا پوچھنا۔ اس لحاظ سے مولوی عبدالحق کا اپنی زندگی میں "بابائے اُردو" بن جانا، بے شبہ ہماری قومی تاریخ کا ایک نادر واقعہ ہے اور اس سے جہاں ایک طرف مولوی صاحب کی عظمت اور اُردو زبان وادب میں اُن کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ابھی ہماری قوم میں جوہر شناسی کی صفتِ محمود باقی ہے۔

مولوی صاحب کی کامیابی اور بڑائی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ انھوں نے اِبتدا ہی سے اپنے سامنے ایک واضح اور متعین مقصد رکھا اور پھر اس مقصد کے حصول کے لیے زندگی بھر سرگرمِ عمل رہے تعلیم سے فراغت پا کر انھوں نے ہر طرف سے آنکھیں موند کر اور ساری دلچسپیوں سے منہ موڑ کر صرف اُردو کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ انھوں نے اپنی ساری توجہ اُردو زبان کی تاریخ، لغت و قواعد کی تحقیق اور قدیم گتھیوں کے سلجھانے پر مرکوز رکھی اور اپنی عمرِ عزیز کے پینسٹھ سال بڑی یک سوئی اور مستقل مزاجی

سے اسی دُھن میں بسر کر دیئے۔ اُردو کے قدیم نادر اور کمیاب تذکروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا، نامانوس اور اجنبی الفاظ کی تشریح کی اور پھر ان پر سیر حاصل، معلومات خیز اور بصیرت آفریں مُقدمے لکھے۔ اُردو زبان کی پیدائش اور آغاز کے ضمن میں انہوں نے بہت سی مشہور اور مقبولِ عام غلطیوں اور نظریوں کی اصلاح کی اور ان کی بدولت اُردو کی عمر میں کئی سو برس کا اضافہ ہو گیا۔

اُردو صرف و نحو کی تجدید بھی مولوی عبدالحق کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اُن کی "قواعد اُردو" سے پہلے، اُردو صرف و نحو کی تالیف و ترتیب میں عام طور سے عربی اور فارسی قواعد کی تقلید کی جاتی تھی، مولوی صاحب نے "قواعد اُردو" لکھ کر یہ حقیقت ثابت کر دی کہ اُردو ایک مستقل زبان ہے جس کی صرف و نحو اس کے مزاج اور مخصوص حالات کے مُطابق مُرتّب ہونی چاہیئے۔ مولوی صاحب کی "قواعد اُردو" اُن کی ذہنی اُپج اور دماغی جدت کی ناقابلِ فراموش یادگار ہے۔ غرض کہ تاریخِ ادب، قواعدِ زبان اور اُردو لغت کی ترتیب و تدوین میں مولوی صاحب نے جو غیر معمولی کوشش کی ہے، اس کا صحیح اندازہ کرنا بھی آسان نہیں۔

○

مولوی عبدالحق نئے لکھنے والوں کی، اگر اُنہوں نے کوئی قابلِ توجہ بات لکھی ہے، جی کھول کر تعریف کرتے ہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلے پہل جب عصمت چغتائی کے افسانوں کا مجموعہ "چوٹیں" چھپا تو اس پر "بعض ثقہ" لوگوں کی طرف سے بڑی لے دے ہوئی ـــــ مولوی صاحب نے جو کچھ فرمایا، اگرچہ اَب وہ لفظ بہ لفظ یاد نہیں لیکن حاصل یہ ہے کہ: "عصمت کو زبان پر بڑی قدرت ہے۔ وہ انسانی نفسیات کی زبردست ماہر ہے۔ اس کے افسانوں کے پلاٹ بھی جاندار ہیں اور کردار بھی حقیقی ـــــ" اس کے بعد فرمایا کہ "بھئی مجھے تو اس چھوکری کے لکھنے پر رشک آتا ہے۔ کیسا پٹر پٹر لکھتی ہے، رکنے کا نام ہی نہیں لیتی ـــــ"

(نورس، کراچی، ص ۷۹ — ۸۱)

حکیم محمد امام امامی :

مجاہدِ اردو

"اردو زبان پر مولوی صاحب کے ایسے احسانات ہیں، جیسے اشاعتِ اسلام کی تحریک پر پہلی ہجری کے مجاہدین کے۔ بر کوچک کے علاوہ مولوی صاحب نے ایران، افغانستان، ترکی، ملایا، عرب، امریکہ، روس اور اٹلی وغیرہ کی یونیورسٹیوں اور علمی اداروں سے خط و کتابت کر کے انہیں اردو کی تعلیم کا انتظام کرنے پر آمادہ کیا۔

مولوی صاحب کا شمار عثمانیہ یونیورسٹی کے بانیوں میں سے ہوتا ہے۔ مولوی صاحب ہی کی کوشش اور رہنمائی میں حیدر آباد دکن میں دار الترجمہ قائم ہوا اور آپ ہی کے طفیل مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبد الماجد دریابادی، سر راس مسعود، مولانا عبد الحلیم شرر، مولانا وحید الدین سلیم، مولانا سید حیدر علی نظم طباطبائی، مولانا عبد الہادی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید ہاشمی فرید آبادی، مولانا قاضی محمد حسین، مولانا سید علی رضا، مولانا الیاس برنی، اور مولانا مرزا مہدی خاں وغیرہ ایسے مشہور ادیب دار الترجمہ کی خدمت بجا لانے پر آمادہ ہوئے اور مولوی عبد الحق صاحب ہی کی توجہ دلانے پر نظام دکن نے اس ادارے کی سرپرستی قبول فرمائی۔

اردو کے تحفظ کے لیے مولوی صاحب نے ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ ان میں بنگال، بہار، یوپی، سی پی، سندھ، کشمیر، گوالیار، رانچی، میسور، بنگلور، آندھرا، شمالی ارکاٹ، جنوبی ارکاٹ، ملیبار وغیرہ کے اجتماعات مشہور ہیں۔

(الشجاع، ص ۱۰۶ — ۱۱۰)

سہیل عظیم آبادی :

بابائے اُردو

مولوی صاحب بے حد منکسر المزاج ، وسیع الاخلاق انسان ہیں ۔ انہیں کوئی ادعا نہیں ، غرور نہیں ، بے حد سادہ طبیعت کے آدمی ہیں ۔ نقصان اُٹھا کر بھی تعلقات برقرار رکھتے ہیں لیکن اصولی معاملات میں وہ مصالحت کے بالکل قائل نہیں ۔

مولوی صاحب کے احباب میں ہندو اور مسلم سب ہی شامل تھے ۔ سر سپرو ، پنڈت کیفی ، پنڈت سندر لال ، ڈاکٹر تارا چند ، سر کیلاش ، نرائن بکسر ، سر دیال کشن کول ، پنڈت بنارسی داس چترویدی بھی اُنہیں اتنے ہی پیارے تھے جتنے عبدالرحمن صدیقی ، شعیب قریشی یا ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ۔

مولوی صاحب آزاد خیال انسان ہیں ۔ قدامت پسندی سے متنفر ہیں لیکن قدامت کی صالح قدروں کے قائل ہیں ۔ انہوں نے ادب میں ترقی پسندی کی تحریک کی پُر زور حمایت کی ۔ پنڈت نہرو ، پریم چند اور سجاد ظہیر صاحبان کے ساتھ ترقی پسند مصنفوں کے اعلان نامے پر اُنہوں نے بھی دستخط کیے تھے ۔

(مجلس ، دکن ، ص ۱۲۵ — ۱۳۳)

سید محمد تقی :

اُردو ، تاریخ کے نئے موڑ پر

اس مضمون میں اُردو کی تاریخ اور اُن چند واضح رجحانات کا جواب تک اُردو

ادب میں موجود رہے ہیں مختصر جائزہ لینے کے بعد نقی صاحب نے فرمایا ہے کہ آج بھی جو مسئلے فوری حل کا تقاضا کر رہے ہیں وہ اردو کے علمی سرمایوں کی نوعیت اور مقدار سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخ دنیا کی کسی ایسی زبان سے متعارف نہیں جو علمی سرمایوں کے بغیر زیادہ عرصہ زندہ رہ سکی ہو۔ انسانی تاریخ مآل کار چند سو مفکرین کی علمی و فکری کاوشوں سے عبارت ہے۔ تاریخِ عالم کے چند اکابر فکر و نظر کی کتابیں اردو میں پہلے ہی آچکی ہیں لیکن ابھی تک عظیم اکثریت ایسی ہے جس سے اردو داں حلقے متعارف نہیں ہوئے ہیں تہذیبیں اور زبانیں فکر کی کثرت اور قلت پر زندہ رہتی، ترقی کرتی یا گرتی اور تباہ ہوا کرتی ہیں۔ اردو کی تمام تاریخ میں مشکل ہی سے چند ایسے نام ملتے ہیں جنھوں نے انسان کے اعلیٰ فکری و ادبی شہپاروں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام کیا ہو اور ان چند میں بابائے اردو کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے۔ مجھے تاریخِ اردو کے کسی ایسے دوام پذیر فکری کارنامے کا علم نہیں، جس کی تکمیل میں مولوی صاحب کا براہِ راست یا بالواسطہ تعاون شاملِ حال نہ رہا ہو۔ مستقبل کی عظیم لسانی کشمکش میں اردو جس ادبی مواد پر تکیہ کرے گی، جن علمی و ادبی فکری مطبوعات کے سہارے اپنی زندگی کا جواز حاصل کرے گی، وہ وہی مواد ہوگا، جس کا سب سے زیادہ حصہ اس نوّے سالہ بوڑھے کی مساعی سے جمع ہو رہا ہے۔

علم و فکر اور زبان و ادب سے جیسا خلوص باباکو ہے وہ صدیوں میں نظر آیا کرتا ہے۔ تاریخ میں صرف چند سو افراد ہی علم و فکر سے ایسی والہانہ محبت رکھنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اردو کی عمر کئی سو سال بڑھادی ہے اور بہت سے نادر مخطوطات کی اشاعت کا بندوبست کیا ہے یہ کلام بلاشبہ قابلِ قدر ہے مگر اس سے مسائل کے حل کرنے میں کچھ زیادہ مدد نہیں ملتی، اُن کا صحیح کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو، کو ایک علمی اور فکری زبان بنانے کی جد و جہد کی ہے۔ انھوں نے تاریخ ساز ادب کو اردو میں منتقل کرانے کا یادگار کام انجام دیا ہے اور وہ بھی کسی مشرق دوستی یا مغرب دشمنی کے جذبے یا کسی عقیدے کے ارتقا کی خواہش سے نہیں بلکہ محض، زبان اور ادب کی خدمت کے جذبے سے جو اس کام کی صحیح نوعیت اور اہمیت کو متعین کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اردو کی آئندہ تاریخ اُن بے مثال کارناموں کو کبھی نہیں بھلا سکتی جو بابائے اردو نے پاکستان کی قومی زبان کو عالمی زبانوں کی سطح پر لانے کے سلسلے میں انجام دیئے ہیں۔

(الشجاع، ص ۴۱ — ۴۵)

رئیس امروہوی:

مولوی عبدالحق ـــ اُردو ـــ پاکستان

مولوی عبدالحق صاحب، اُس سلسلۃ الذہب (زنجیرۂ طلائی) کی ایک قیمتی کڑی ہیں جو حال کو ماضی یا تہذیبِ جدید کو تہذیبِ قدیم سے منسلک کرتی ہے۔ اُن کی شخصیت دو دنیاؤں کو محیط ہے۔ ایک وہ جو انیسویں صدی ختم ہونے سے قبل ختم ہوگئی اور ایک وہ دنیا جس کا آغاز بیسویں صدی سے ہُوا۔

مولوی عبدالحق اس عہد میں برِ کوچک کے مایۂ ناز تمدّن یا "اُردو ثقافت" کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ مولوی صاحب فقط ایک شخص نہیں، ایک شخصیت ہیں جس کو بنانے اور سنوارنے میں ہمارے ہزار سالہ تمدّنی مُحرّکات نے بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ کسی قوم کی تہذیبی روح اپنے بھرپور اظہار کے لیے کبھی کبھی چند افراد کو چُن لیا کرتی ہے۔ انیسویں صدی میں یہ سعادت سرسید، حالی اور شبلی کے حصے میں آئی تھی کہ وہ کروڑوں انسانوں کے ذہنی اور روحانی میلانات کا مظہرِ کامل بن گئے تھے اور اس زمانے میں مولوی عبدالحق اس قوم کے تمدّنی مزاج اور تخلیقی استعداد کا پیمانہ ہیں۔

سرسید کی ثقافتی تحریک نے اُردو زبان و ادب پر گہرے اثرات ڈالے، خود اُردو زبان نے مسلمانوں کی ذہنی بیداری میں بے مثال حصہ لیا اس طرح ہماری قومی تحریک اور اُردو مترادف المعنی بن گئیں۔ اُردو سے مولوی عبدالحق کی شیفتگی کا سبب درحقیقت اس زبان کی ثقافتی اور تاریخی حیثیت ہے۔ مولوی عبدالحق اُردو کی اہمیت سے انکار کو قومی توہین اور ثقافتی کفر قرار دیتے ہیں۔

بابائے اُردو، اُردو کے ثقافتی مزاج کا جامع ترین نمونہ ہیں۔ اُنھوں نے سرسید کے عہد میں آنکھیں کھولیں اور ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اُن کی زیارت کی۔ مسلم قومیت کے مطالبے کا ثقافتی اور فکری پس منظر کوئی مولوی عبدالحق صاحب سے دریافت کرے تب اُسے پتہ چلے کہ قومی زندگی کے وہ کون

سے محرکات تھے جنھوں نے سرسید سے کام لیا، وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے سرسید کو علی گڑھ تحریک کا قائد بنادیا وہ کونسی طاقتیں تھیں جنھوں نے مسلمانوں کی اس نئی قومی بیداری کو اردو زبان وادب کی نشرواشاعت کے لیے استعمال کیا اور پھر کس طرح رفتہ رفتہ ہم ثقافت، ادب اور تعلیم کی وادیاں طے کرتے کرتے پاکستان کی منزل تک پہنچے۔

اردو ہماری ذہنی بیداری کی نقیب، روحانی جدوجہد کی ترجمان اور تخلیقی استعداد کا پیمانہ رہی ہے مولوی صاحب اُس ثقافتی اور روحانی تحریک کے زیرِ سایہ پلے بڑھے ہیں جو انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد پوری طاقت سے شروع ہوئی اور قیام پاکستان پر منتج ہوئی۔ تحریکِ پاکستان کا مزاج دان مولوی صاحب سے بہتر اور کون ہوگا۔ (الشجاع، ص ۷۵-۷۸)

پروفیسر ہارون خان شروانی:
دکن مجلس قانون ساز، آندھرا پردیش

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

مضمون نگار نے مولوی عبدالحق صاحب سے اپنے تعلق اور چند ملاقاتوں کا احوال لکھا ہے اور مولوی صاحب کے بارے میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مولوی صاحب محض ایک انسان ہی نہیں، محض بابائے اردو ہی نہیں اعلیٰ ترین اعزازی ڈگری یا ہلال پاکستان سے اُن کی عزت کچھ بڑھ نہیں گئی، وہ ایک مجسم ادارہ ہیں۔ (مجلس، دکن، ص ۳۷-۴۱)

پروفیسر سید مبارز الدین رفعت :
گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج ، گلبرگہ

بابائے اُردو

بابائے اُردو کی ذات اور خدمات سے متعلق یہ مضمون اُردو مجلس ، دکن کی طرف سے منائے ہوئے "یوم مولوی عبدالحق" پر ۲۹ مئی ۱۹۶۰ء کو پڑھا گیا۔ مضمون نگار نے لکھا ہے اور بالکل بجا کہ اُردو ادب کی پوری تاریخ میں اُردو کی گوناگوں خدمات کے تعلق سے اتنی ہمہ گیر شخصیت ڈھونڈے سے نہیں ملتی جو مولانا عبدالحق سے زیادہ "بابائے اُردو" کے لقب کی مستحق ہو۔ اُن کی اُردو خدمات کے ایک دو نہیں کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو اپنی جگہ نہایت درجہ اہم اور نہایت درجہ تابناک ہے۔ بابائے اُردو اور انجمن ترقی اُردو ہم معنی لفظ ہیں بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی "معتمد انجمن ترقی اُردو" ان کا مختصر تخلص ہے۔ مولوی صاحب کو بہت صدمات بھی سہنے پڑے۔ خدا ہی اُن کے داغوں کا شمار جانے جو بابائے اُردو نے اپنے کام کی راہ میں کھائے ہیں۔ یہ سال خوردہ لیکن جواں ہمت بابائے اُردو ہی کا دل گردہ ہے کہ وہ ہر معرکے سے سرخرو اور کامیاب ہو کر نکلے۔ (مجلس ، دکن ، ص ۳۳ - ۳۶)

محمد اکبر علی :
ایم۔ اے ، ایل ایل بی

ڈاکٹر عبدالحق اور اُن کی خدمات

ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے جس خلوص و ایثار ، محبت و بے غرضی اور جوش و استقلال کے ساتھ اردو کی خدمت کی ہے ، اس کی مثال زبان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کی زندگی کی کہانی یقین و محنت

عمل و استقلال اور خلوص و ایثار کی کہانی ہے۔ (مجلس، دکن، ص ۱۷۵ــ۱۸۱)

ضیاء الدین احمد برنی :

مولوی عبدالحق

دُنیا میں بہت کم آدمی ایسے ہیں جنہوں نے ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی ہوں، مولوی عبدالحق انہی لوگوں میں سے ہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا اُردو ہے۔ مولوی صاحب مُصنّف ہیں۔ مولوی صاحب اِس بڑھاپے میں بھی شگفتہ طبیعت رکھتے ہیں اور اُن بوڑھوں کی طرح نہیں ہیں جو بڑھاپے میں مرنے کی دُعائیں مانگتے رہتے ہوں۔ مولوی صاحب جیے جاتے ہیں اور اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ حال ہی میں اُنہوں نے سرسید پر ایک کتاب لکھی ہے، اِسے "حیاتِ جاوید" کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔

(نورس، کراچی، ص ۱۴۲ــ۱۴۳)

خان بہادر نقی محمدؐ خان خورجوی :

مُجدّدِ اُردو

جو لوگ اُردو کے مُحسن ہیں اور جنہوں نے مخالفتوں کا ہمیشہ مقابلہ کیا اُن میں سب سے ممتاز نام سرسید احمد خاں کا ہے جو آخر دم تک اس کی حمایت میں مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ جب سرسید اور ان کے ساتھی نہ رہے تو یہ "دردِ سر" مولوی عبدالحق کے حصّے میں آیا اور اُنہوں نے اپنی تمام عمر اُردو کی ترقی اور حمایت میں صرف کردی اور اس کام میں ایسے محو ہُوئے کہ زر، زمین، زن جو زندگی کے لوازماتِ

خصوصی ہیں، سب سے بے نیاز ہو گئے۔ اُردو زبان پر مولانا کا بڑا احسان ہے۔

(نورس، کراچی، ص ۱۰۱-۱۰۲)

ولایت علی بیگ :

چند یادیں ـــــ چند تأثرات

مَیں، مولوی صاحب کو ایک عرصے سے جانتا ہوں۔ آپ کی خانگی زندگی کے متعلق مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ جنگِ بلقان کے زمانے میں جامع مسجد میں، آپ مجھے نظر آتے۔ مَیں نے آپ کے کمرے میں جانماز ہر وقت رکھی دیکھی، آپ کا روزانہ کا معمول یہ تھا کہ علی الصباح مسواک کرتے ہوئے مقبرۂ رابعہ دورانی کی شمالی پہاڑیوں میں تنہا نکل جاتے۔ گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ گھوم کر پھر واپس لوٹتے۔ رات میں بنگلے سے باہر حوض کے کنارے پلنگ پر استراحت فرماتے۔ اکثر درندے تیندوے وغیرہ پانی پینے اس حوض پر آتے اور اس شیر کو محوِ خواب پا کر اپنی دُم دبائے روانہ ہو جاتے۔ (نورس، کراچی، ص ۱۲۱-۱۲۳)

بہار کوٹی :

خدمتِ قوم اور مولوی عبد الحق

انقلاب کے سائے میں مولوی صاحب کے ساتھی جن میں شاید اُن سے کم صلاحیتیں تھیں، سیاست کے زینے سے بڑے بلند و بالا مقام پر فائز ہو گئے مگر مولوی صاحب کا نعرہ وہی "اُردو پڑھو، اردو لکھو، اُردو بولو" ہے۔ اُردو کی خدمت براہِ راست ملک و قوم کی خدمت ہے، یہ حقیقت اُن پر ہوش سنبھالتے ہی واضح

ہو چکی تھی۔ اُردو پر مولوی صاحب کا احسانِ عظیم ہے، صرف اُردو پر ہی نہیں قوم پر بھی۔

(نورس، کراچی، ص ۱۱۵-۱۱۹)

نظر حیدرآبادی:

مولوی عبدالحق

(ایک تحریک، ایک ادارہ)

اِس مختصر سے مضمون میں "مولوی عبدالحق کے قلم اور اُن کے کردار و عمل کی باتیں" کی گئی ہیں۔

(مجلس، ص ۱۵۷-۱۵۹)

شیخ عبدالعلیم خزاں:

اُردو اور بابائے اُردو

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی نوزدہ سالہ جوبلی کے موقع پر ادارہ "نورس" (انجمن بنی باغ اسکول) نے طلبہ کے لیے مضمون نگاری کا ایک انعامی مقابلہ کرایا تھا۔ اس مقابلے میں اس مضمون پر اول انعام مبلغ پچاس روپے دیا گیا۔ مضمون میں مولوی صاحب کی خدماتِ جلیلہ اور ان کی ذاتِ والاصفات کو عقیدت مندانہ خراج ادا کیا گیا ہے۔

(نورس، کراچی، ۱۷۰-۱۷۴)

مولانا سیّد ہاشمی فریدآبادی :

مولوی عبدالحق کی انشاپردازی

(ایک نمونہ)

مولوی عبدالحق کی انشاپردازی کے ایک "دل چسپ نمونے" کے طور پر ایک خط نقل کیا گیا ہے جو حیدرآباد دکن سے ۱۱۔ اگست ۱۹۲۷ء کو مولوی عبدالحق نے اپنے ایک بہت قدیم اور بڑے مخلص دوست افسرالاطبا حکیم امتیازالدین کے انتقال پر مولانا ہاشمی فریدآبادی کو لکھا۔ یہی خط "چند ہم عصر" میں حکیم امتیازالدین کے مرقّع کے طور پر شامل ہے۔

(نورس، اورنگ آباد، ص ۵۸ — ۶۳)

مولانا سید ہاشمی فریدآبادی :

مولوی عبدالحق صاحب کے چند خطوط

ہاشمی صاحب نے ایضاحی کلمات کے ساتھ، مولوی عبدالحق کے چار خط شائع کرائے ہیں۔ یہ سب اورنگ آباد سے لکھے گئے ہیں پہلے تین خط ہاشمی صاحب کے نام ہیں۔ چوتھا، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے نام ہے۔ ڈاکٹر انصاری کا جواب بنام عبدالحق بھی آخر میں شامل ہے پہلا خط ۲۲۔ دے، دوسرا ۲۹۔ امرداد ۳۵ف اور تیسرا خط ۲۵ مارچ ۱۹۲۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر انصاری کے نام خط ۸ نومبر ۱۹۲ء اور ان کا جواب ۱۲۔ نومبر ۱۹۲۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ سب خط کسی نہ کسی وجہ سے بہت اہم اور یادگار ہیں۔

(جوہر، ص ۵۵ — ۶۵)

"زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے!"

موہن داس کرم چند گاندھی	سر کشن پرشاد	سر تیج بہادر سپرو
مسز سروجنی نائیڈو	پنڈت سندر لال	خالدہ ادیب خانم
ڈاکٹر سر اکبر حیدری	ڈاکٹر سید محمود	ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان
سر شیخ عبد القادر	سید سلیمان ندوی	خواجہ غلام السیدین
نواب زین یار جنگ	ذوالفقار علی بھٹو	پروفیسر رشید احمد صدیقی
پروفیسر آل احمد سرور	ڈاکٹر عبد الستار صدیقی	ڈاکٹر سید عبد اللہ
مولانا عبد الماجد دریا بادی	جسٹس ایس۔اے۔رحمٰن	نیاز فتحپوری
پروفیسر سید احتشام حسین	اثر لکھنوی	ڈاکٹر یوسف حسین خاں
فراق گورکھپوری	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	پروفیسر نجیب اشرف ندوی
عبد الرحمٰن چغتائی	پروفیسر حمید احمد خاں	پروفیسر عبد القادر سروری
ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	ڈاکٹر محمد شہید اللہ	ڈاکٹر محمد حسن
ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی	ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ	ڈاکٹر گیان چند
ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی	شاہد احمد دہلوی	مولانا غلام رسول مہر
میاں بشیر احمد	سلام مچھلی شہری	شاد عارفی
خواجہ محمد شفیع دہلوی	عادل رشید	ڈاکٹر سلامت اللہ
عرش ملسیانی	جہاں بانو نقوی	کرشن چندر
نریش کمار شاد	گوپی ناتھ امن	پرتھوی ناتھ شرما

گاندھی، موہن داس کرم چند:

اس میں کچھ شک نہیں ہے
کہ مولانا عبدالحق صاحب نے
اردو زبان کی بڑی خدمت
کی ہے

آپکا
مو. ک. گاندھی

سیگاؤں
وردھا
۲۴ / ۴۵

(جوہر، صفحہ ۳)

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد:

مولوی عبدالحق صاحب کی ہستی اُردو علم و ادب کے لیے ایک بیش بہا نعمت ہے، جس کی وجہ سے اُن کا شمار اُردو ادب کے محسنوں میں ہونا ہر لحاظ سے بجا ہے۔ وہ قومی زبان کو پھیلانے کی جو انتھک کوشش کر رہے ہیں، جس خوش اسلوبی سے وہ اُردو کو فرقہ واریت سے بالاتر رکھنے کی قابلِ قدر خدمت انجام دے رہے ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ اُردو کو سہل اور

عام فہم بنانے میں جو مسلسل محنت کر رہے ہیں، اُس وجہ سے اُن کا شمار ملک کے سچّے بہی خواہوں میں ہونا لازمی ہے۔ (جوہر، صفحہ ۵)

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو:

ڈاکٹر عبدالحق صاحب موصوف نے جو اس وقت تک اُردو زبان کی خدمت کی ہے، اس کے بارِ احسان سے ہم سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ مولانا موصوف کی خدمت میں مجھ کو عرصے سے نیاز حاصل ہے اور میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ایسے اعتدال پسند اور مُنصف مزاج ادیب فی زمانہ ہندوستان میں بہت کم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی صُلح کُن پالیسی سے اُمید ہے کہ زبان اُن خطروں سے جن کا مُقابلہ اس کو کرنا پڑ رہا ہے، محفوظ رہ کر روز بروز ترقی کرے گی۔

(جوہر، صفحہ ۵)

مسز سروجنی نائیڈو:

میرے قدیم اور عزیز دوست مولوی عبدالحق صاحب ایک مدت سے اُردو اور اس کے خوش نما ادب کی جو عالمانہ خدمت کر رہے ہیں، اُس کا تقاضا ہے کہ جس زبان میں غالبؔ اور ذوقؔ اور سوداؔ نے اپنے لافانی شعر لکھے، اُس کے چاہنے والے، سب کے سب، اُن کی خدمت میں ہدیۂ منت و تحسین پیش کریں۔ خدا کرے مولوی صاحب کا سایہ عرصے تک ہمارے سر پر قائم رہے اور وہ قصرِ اُردو کی نگہبانی کرتے رہیں (جوہر، صفحہ ۱۳)

پنڈت سندر لال:

مولوی عبدالحق سے زیادہ مخلص خادم، اُردو کا مجھے دوسرا نہیں ملا اور نہ اب تک کسی نے اُردو کی اتنی زیادہ عملی خدمت کی ہے۔ اُن سے زیادہ سچا مُحبِ وطن اور ایک "مشترکہ ہندوستانی

قومیت" کا حامی، مَیں نے نہیں دیکھا۔ میں اُنہیں اپنے عزیز ترین دوستوں اور بزرگوں میں شمار کرتا ہوں۔ (مجلس، صفحہ ۲۰۱)

خالدہ ادیب خانم:

سن رسیدہ عُلماء میں، جو ادبی تحقیقات اور زبان اُردو پر جدید معروض اصول کے مُطابق ناقدانہ تصنیفات کرنے میں غیر معمولی جامعیت رکھتے ہیں، مولانا عبدالحق ہیں۔ نہ صرف عالم بلکہ اس یادگار کام (یعنی جامعہ عثمانیہ) کو جن دماغوں نے بنایا ہے، اُن میں شامل ہونے کے باعث بھی اُن کا پیہم ذکر آتا ہے۔ مولوی عبدالحق کا علمی تبحّر جامعہ میں تصنیفی مادہ پیدا کر رہا ہے۔

(الشجاع، صفحہ ۱۲۲)

نواب حیدر نواز جنگ
ڈاکٹر سر اکبر حیدری:

مولوی عبدالحق صاحب اُردو زبان کے مُحقق اور بہت بڑے نقاد اور صاحب طرز ادیب ہیں لیکن سب سے بڑھ کر مولوی صاحب کی وہ شخصیت ہے جس کے اثر اور قوت سے اُنہوں نے اُردو زبان و ادب کے دامن کو وسیع کیا، اُن کی بے لوث اور پیہم کوششیں جو اُردو کو ایک پائیدار اور علمی زبان بنانے میں صرف ہوتی رہی ہیں، کبھی محو نہیں ہو سکتیں — حیدر آباد سے مولوی صاحب کا بہت گہرا قریبی اور وسیع تعلق رہا ہے اور اُن کی زندگی کا بہترین زمانہ یہیں بسر ہوا۔ جہاں مختلف حیثیتوں سے اُنہوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ تر خدمات انجام دیں۔ زبان اُردو پر اپنی اہم تصانیف کے علاوہ انجمن ترقی اُردو کے ذریعے انہوں نے اُردو کی جو خدمات انجام دی ہیں، وہ اُردو زبان کی تاریخ میں نمایاں رہیں گی۔

(جوہر، صفحہ ۴)

ڈاکٹر سیّد محمود :

مولانا عبدالحق صاحب کی خدمت کا ذکر کرنا میرے بس کا کام نہیں، اردو زبان کی جو بے لوث اور ان تھک خدمت وُہ ایک عرصۂ دراز سے کر رہے ہیں، وہ خود اِس قدر مُہتم بالشان ہے جس سے ملک کا بچّہ بچّہ واقف ہے۔ جب کبھی ہندوستان میں ہندو مُسلم اتحاد کا دور آئے گا، اس وقت لوگوں کو احساس ہو گا کہ اُردو زبان کا اس اتحاد میں کتنا بڑا حصہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ اُسی وقت لوگوں کو مولانا عبدالحق صاحب کی خدمات کا اصلی معنوں میں احساس ہو گا۔ خدا اُن کو عمرِ نوح دے اور ہم میں بہت سے عبدالحق پیدا کر دے۔

(جوہر، صفحہ ۱۰، ۱۱)

ڈاکٹر سر شاہ محمّد سُلیمان :

علامہ ڈاکٹر عبدالحق موصوف کی خدمات، اُردو زبان کی ترقی اور فروغ کے سلسلے میں ایسی نہیں ہیں جو ملک میں محتاجِ تعارف ہوں اور اُردو چونکہ ہمارے ملک کی مشترکہ زبان اور مختلف مللِ ہند کے اختلاط و اتفاق کی ایک زندہ یادگار ہے، اس لئے ہر فرزندِ وطن کا یہ فرض ہے کہ علامہ موصوف کی خدمات کو بہ نظرِ قدر دانی و ہمت افزائی دیکھے اور دوسروں کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب دے۔

(جوہر، صفحہ ۶)

سر شیخ عبدالقادر :

یوں تو زبانِ اُردو کے خادم اور محسن مولانا ڈاکٹر عبدالحق کی ساری عمر اُردو ادب کی خدمت میں گزری ہے اور رسالہ "اُردو" اور "انجمن ترقی اُردو" نے جو اعلیٰ کام کیا ہے وہ کسی

اُردو داں سے پوشیدہ نہیں، مگر گزشتہ چند سال سے جس دلیری اور جس سچے جذبۂ ایثار کے ساتھ ڈاکٹر عبدالحق نے زبان اُردو کی حمایت میں اپنے آپ کو سینہ سپر کیا ہے، اُس کے لیے اُن کا جتنا بھی شکرادا کیا جائے کم ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کافی الفاظ نہیں مل سکتے

(جوہر، صفحہ ۱۳)

مولانا سید سلیمان ندوی:

ملک کے پورے طول و عرض میں، جس میں اُردو زبان کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں سے بڑھی ہوئی ہے، اس کی خدمت کرنے والوں کی تعداد اگر مولوی عبدالحق نہ ہوتے تو صفر ہوتی۔ وہ پیری میں بھی ہمت سے کام کر رہے ہیں اور اپنے قلم، قدم اور درم سے اس کی ترقی کی یادگار کوششیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے سادہ نگاری کو ترقی دی، نقد و تبصرے کی نئی راہ نکالی، اُردو کی تاریخ کئی سو سال آگے بڑھادی اُدب اور تاریخ ادب پر تحقیقی مضمون لکھے، اُردو کے قواعد کو نئے سرے سے مُرتّب کیا، اُردو لغت، اُردو تذکرے، اُردو کے پرانے دیوان اور اُردو میں نئے علوم کی عمدہ کتابیں چھپوائیں اور لکھوائیں اور انجمن ترقی اُردو کو ہر حیثیت سے وہ ترقی دی کہ آج وہ ملک کا ایک زندہ ادارہ ہے۔

(جوہر، صفحہ ۱۴)

خواجہ غلام السیّدین:

مولوی عبدالحق صاحب نے جس خلوص، دل سوزی اور یکسوئی کے ساتھ اُردو کی خدمت کی ہے، اُس کی مثال زبان و ادب کے میدان میں تو کیا، قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی بہت کم ملے گی۔ اُن کے لئے نواب مہدی یار جنگ کا یہ جملہ بہت ہی موزوں ہے کہ انھوں نے "فنا فی الاُردو ہو کر بقا بالاُردو" کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اُن کی سالگرہ منانا، دراصل

اُردو زبان اور اُردو ادب کی ترقی اور توسیع کی سالگرہ منانا ہے۔ اُن کی خدمات کے اعتراف سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہم میں اب تک جوہر شناسی کی صفت موجود ہے اور ہم اپنے اُن محسنوں کی حقیقی قدر پہچانتے ہیں جو خاموشی کے ساتھ تعمیری خدمت کرتے ہیں —— خدا کرے اُن کے بہت سے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو اسی بے نفسی اور انہماک کے ساتھ اردو کی خدمت کرنے کی توفیق ہو جس طرح انھوں نے خود تمام عمر اُردو کی خدمت کی ہے۔

(جوہر، صفحہ ۱۵)

پدما بھوشن نواب زین یار جنگ:

اُردو کی کشتی جو متزلزل ہو رہی ہے، اُس کے سنبھالنے میں مولوی عبدالحق صاحب نے جو بلند ہمتی سے کام لیا ہے۔ وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اُردو زبان میں جو روح انھوں نے بھری ہے، وہ زمانے کے نامساعد حالات سے زیروزبر ہونے والی نہیں۔ اُردو کو سلیس بنانے اور نئے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اُنھوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ اُردو کے پروانوں کو انھوں نے ایک سیدھی سادی راہ بتا دی ہے۔

(مجلس، صفحہ ۲۰۵)

ذوالفقار علی بھٹو:

فروغ اُردو کے سلسلے میں مولانا عبدالحق کی خدماتِ جلیلہ اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہیں گی، اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے اُن کا انہماک، ان تھک مساعی اور باوجود بے شمار موانعات کے، اُن کی مسلسل جدوجہد کی مثال کسی زبان کی تاریخ مشکل سے ہی پیش کر سکتی ہے۔

(الشجاع، مابین صفحہ ۸ اور ۹)

پروفیسر رشید احمد صدیقی:

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا شمار اُردو کے بڑے سے بڑے محسنوں میں ہمیشہ کیا جائے گا۔ اُردو کی پوری تاریخ میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا، جس نے اتنی دشواریوں کے باوجود اتنی طویل مُدت تک ہر دوسرے تعلق سے مُنہ موڑ کر، اس خلوص، قابلیت اور پامردی سے اُردو کی اتنی گراں قدر مختلف التنوع خدمات انجام دی ہوں جتنی کہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے۔ ان خدمات کا گننا بھی آسان نہیں۔ اُردو میں تدقیقاتِ علمیہ و عالیہ کی باضابطہ داغ بیل مولوی صاحب نے ڈالی جس پر طرح طرح کی عمارتیں جا بجا کھڑی ہو رہی ہیں۔ قدیم اُردو کو موصوف نے نئی زندگی دی۔ اُردو لکھنے کا جو مفید، ممتاز اور مشکل اسلوب مولوی صاحب کا ہے، اُسے اُردو کا بنیادی اسٹائل کہہ سکتے ہیں۔ اس اسٹائل نے اُردو کو دنیا کی مشہور اور اہم زبانوں کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔ مولوی صاحب اُردو کے لیے تمام عمر لڑتے رہے۔ اتنی بڑی لڑائی تنہا ایک شخص نے کم و بیش تین نسلوں تک شاید کبھی لڑی ہو بجا طور پر وہ "بابائے اُردو" کہے جاتے ہیں۔ اس خطاب کے موزوں ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ایک طویل نامعلوم مدت تک بابائے اردو ہونے کا بجا افتخار و امتیاز شاید ہی کسی اور کو حاصل ہو سکے۔ اُردو کی دوستی میں اتنی دشمنی بھی شاید ہی کسی اور نے مول لی ہو۔

(الشجاع، صفحہ ۱۲)

پروفیسر آلِ احمد سرور:

میری نظر سے بہت سے محقق، نقاد، انشا پرداز گزرے ہیں مگر اُردو کا مولوی عبدالحق ایسا عاشق نظر سے نہیں گزرا۔ انھوں نے نوجوانوں کی ہمت افزائی کی ہے، کام کرنے والوں کا دل بڑھایا ہے، وقت کی رفتار کو پہچانا ہے، ادب کے تہذیبی اور سماجی رول کو واضح کیا ہے اور اپنی بلند ہمتی اور سعی پیہم سے مایوسی کی گھٹاؤں میں اُمید کی کرنیں دوڑائی ہیں۔ اُن کی پالیسی یا طریقۂ کار سے

اختلاف ممکن ہے، مگر اُن کے خلوص، اُن کے ریاض، اُن کی نظر اور اُن کے کردار کی عظمت سے انکار کرنا ہٹ دھرمی کے مترادف ہوگا۔ اُن کی تحریر میں وہی زور اور روانی ہے جو عقیدے کی مضبوطی اور دُھن کی جولانی سے آتی ہے۔ دیو زادوں کی اُس نسل کی وہ آخری یادگار ہیں، جس نے سرسیّد کی آنکھیں دیکھی تھیں اور اُن کے فیضِ صحبت سے کیمیاگری سیکھی تھی۔

(الشجاع، صفحہ ۱۵)

مولوی صاحب ایک بڑے محقق، ایک صاحبِ نظر ادیب، ایک بالغ نظر نقاد اور اُردو زبان کے لیے مسلسل جدوجہد کرنے والے ایک سپاہی ہیں اُن کی زندگی سے اُردو کی خدمت کا ولولہ حاصل کرنا چاہیے۔

(مجلس، صفحہ ۲۰۴)

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی:

مولوی عبدالحق کے اوصاف اور ان کے کارناموں کے لیے صرف دو لفظ کافی ہیں: وفاداری اور اُستواری۔ جس خدمت کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا، عمر بھر اُس کے سوا کسی طرف مُڑ کر نہ دیکھا بس یہی وہ وصف ہے اور یہی وہ کمال ہے جس نے عبدالحق کو "عبدالحق" بنایا۔ اسی نے قوت بخشی، اسی نے عمرِ طویل خدا اس طویل کو طویل تر کرے۔

(الشجاع، صفحہ ۱۶)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ:

مولوی عبدالحق درحقیقت ایک پورا عہد اور ایک پورا ادارہ ہیں اور اُن کا فیض ابھی جاری ہے اور منزلِ ذوق و شوق کے راہ رووں کو عزم و ہمت اور صبر و استقلال کے ساتھ کام کرنے کا سبق دے رہا ہے۔ بابائے اُردو نے تحقیق کا ایک بلند معیار قائم کیا اور بے لاگ اور

دل نشیں تنقید کے ذریعے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی اور اُن کی تربیت بھی کی۔ اُردو زبان و ادب پر انھوں نے جو احسانات کیے ان کی مثال مشکل سے ہی مل سکے گی —

(الشجاع، صفحہ ۱۶)

مولانا عبدالماجد دریا بادی:

اُردو کے محسنوں اور مخلص خادموں کی فہرست مختصر نہیں، اچھی خاصی طویل ہے سینکڑوں ناموں سے متجاوز اور خدمات کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک۔ پھر بھی اگر مجموعی طور پر کسی ایک کو محسنِ اعظم کا لقب دیا جا سکتا ہے تو وہ ذات بلا اختلاف بابائے اُردو عبدالحق ہی کی ہو سکتی ہے — ۱۹۱۲ء سے اپنے کو مسلسل خدمتِ اُردو ہی کے لیے وقف کیے ہیں۔ خدمات بھی کیسی ٹھوس بیش قیمت اور قابلِ رشک!

(الشجاع، صفحہ ۱۰)

جسٹس، ایس اے رحمٰن:

ڈاکٹر مولوی عبدالحق اپنی ذات میں خود انجمنِ اُردو ہیں۔ ان کی ساری عمر اُردو کی خدمت گزاری میں گزری ہے اور پیرانہ سالی میں بھی وہ اُسی انہماک سے اُردو کے لیے اپنی صلاحیتیں وقف کر رہے ہیں جس نے انہیں عہدِ شباب میں بے قرار رکھا۔ حق یہ ہے کہ بابائے اُردو کا خطاب مولوی عبدالحق کے قامت پر راست آتا ہے۔ ہمیں ایسے ہی دو چار مجنوؤں کی ضرورت ہے۔

(الشجاع، صفحہ ۱۰)

علامہ نیاز فتحپوری:

ڈاکٹر عبدالحق، اور اُن کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کے متعلق کم سے کم جو کچھ کہا جا

سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

زیادہ سے زیادہ کے لئے کوئی لفظ نہیں۔

(الشجاع، صفحہ ۱۰)

پروفیسر سید احتشام حسین:

کام کی لگن اور خدمت کس طرح ایک ذات کو صفت کا مجسمہ بناتی ہے، اس کی ایک اعلیٰ مثال مولوی عبدالحق صاحب کی ذات ہے۔ پچاس سال تک اُردو زبان و ادب کی اَن تھک خدمت نے اُن کے نام کو اُردو کے ساتھ اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ دونوں کا تصور ایک ساتھ ذہن میں آتا ہے انھوں نے اپنی زندگی کے صبح شام اُردو ہی کی محبت میں بسر کیے اور اپنا سب کچھ اسی پر نچھاور کیا یکسوئی اور یک دلی کے ساتھ زبان و ادب سے ایسی وابستگی کی مثال دوسری زبانیں بھی مشکل ہی سے پیش کر سکیں گی۔ پچاس سال کسی زبان کی عمر میں کچھ بہت زیادہ نہیں ہوتے لیکن اُردو زبان کو گزشتہ پچاس سال میں جس نشیب و فراز سے گزرنا پڑا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے یہ نصف صدی کئی صدیوں کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ اس زمانے میں اُردو کی خدمت، محض تخلیقی اور تنقیدی کام کرنے تک محدود نہیں تھی، ذہن اور عمل کی وہ تمام قوتیں چاہتی تھی جو کسی تہذیبی روایت کو زندہ اور متحرک رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس بات کو سمجھا اور اس کے تہذیبی اور سماجی پہلوؤں کو علمی اور ادبی پہلوؤں کا ہم پلّہ بنا کر اسے دورِ جدید میں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی قوت عطا کی۔ اُردو زبان کی اس تہذیبی اور لسانی اہمیت کے نمایاں کرنے میں تنہا انھوں نے جتنا کام کیا ہے وہ بہت سے آدمیوں سے مل کر بھی ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کو اُن کے ادبی کارناموں سے اختلاف ہو، ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف ہو، لیکن اُردو زبان کا کوئی شیدائی اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتا کہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں اُردو کو جو مقام حاصل

ہے، اُس میں مولانا عبدالحق کی کششوں کا پلہ سب سے زیادہ بھاری ہے" وفاداری بشرطِ استواری" کی ایسی شاندار مثال مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ جن لوگوں کو اُردو کے مستقبل پر یقین ہے، انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مستقبل، عمل اور خدمت کے اس جذبے سے روشن ہو گا جس نے مولانا کے وجود میں آگ لگا رکھی ہے اور اس ضعیفی میں بھی قوتِ عمل کو کمزور نہیں کیا ہے۔

(الشجاع، صفحہ ۱۱)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں :

مولوی عبدالحق صاحب کی حیثیت اب ایک فرد کی نہیں رہی بلکہ ایک ادارہ کی ہو گئی ہے۔ انھوں نے گزشتہ ساٹھ سال میں اُردو زبان و ادب کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ہمیشہ یاد رہے گی اور آئندہ نسلوں کے لیے اس میں ایک سبق رہے گا۔

(مجلس، صفحہ ۲۰۳)

فراق گورکھپوری :

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی اعلیٰ خدمات کی یاد ہند و پاک میں لوگ آسانی سے فراموش نہ کر سکیں گے۔ خود میں نے اُن کی تحریروں سے ادبیاتِ عالیہ کا درس لیا ہے۔ اُن کی نثر میرے لیے اور مجھ جیسے کئی اوروں کے لیے چراغِ راہ رہی ہے۔ کاش مجھے یہ توفیق ہوتی کہ کچھ عرصے تک اُن کے قریب رہ کر اپنے ذوقِ ادب پر احسان کرتا۔ (الشجاع، صفحہ ۱۸)

اثر لکھنوی :

بابائے اُردو کے زبان پر اتنے احسانات ہیں کہ یہ اُن سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی کہیں صدیوں میں ایسے مایۂ ناز اشخاص پیدا ہوتے ہیں۔ (الشجاع، صفحہ ۲۱)

پروفیسر نجیب اشرف ندوی :

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، اُس وقت سے اب تک مولانا کی تقریر و تحریر سے مستفید ہی نہیں ہوتا رہتا ہوں، بلکہ پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ خلوص و وفاداری، ایثار و قربانی اور مسلسل عمل کو اگر ایک جگہ جمع کیا جا سکتا ہے تو جہاں تک ہماری زبان و ادب کی خدمت کا تعلق ہے، یہ تمام چیزیں، ڈاکٹر عبدالحق کی ایک اور صرف ایک ذاتِ بابرکات میں جمع ہیں۔

(الشجاع، صفحہ ۱۹)

عبدالرحمٰن چغتائی :

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی شخصیت میرے لیے ایک جانی پہچانی شخصیت ہے جس کے اعتراف سے میری کئی آرزوئیں پرورش پاتی رہی ہیں۔ میں نے راجاؤں، مہاراجاؤں، نوابوں، بیگموں مہارانیوں، گورنر اور وائسراؤں سے ہاتھ ملائے ہیں، یہاں تک کہ وقت کے بادشاہوں اور شہنشاہوں سے بھی ہاتھ ملائے ہیں، مگر مجھے وہ لمحے آج بھی گدگدا دیتے ہیں، جب میں نے مولوی عبدالحق جیسے مخلص سے ہاتھ ملایا اور بغل گیر ہوا اور یوں محسوس ہوتا تھا، صدیوں کا علم و ادب اور یادیں ان کی شخصیت میں سمٹ آئی ہیں۔ اتفاقیہ وہ اُس وقت میرے آبائی مکان میں کھڑے تھے، اُن کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا، وہ کہہ رہے تھے: اورنگ آباد آئیے، آپ کو ایلورا اور اجنتا کے غار دکھائیں گے اور یہ دعوت رسمی نہیں، الفاظ رسمی نہیں، آرٹسٹ کے سامنے محض اپنے مخلصانہ جذبات کا اظہار ہے۔

مولانا نے زندگی بھر شادی نہیں کی اور میں نے حدِ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کی سفید ریش اور بڑھاپا دیکھتے ہوئے ایسے ہی مذاق سے کہا تھا، مولانا اگر شادی سے محروم رہ کر بھی انسان کا یہی حال ہوتا ہے تو شادی جیسی نعمت سے محروم رہنے سے فائدہ بھی کیا؟ وہ مسکراتے رہے

اُن کی روحانی بصیرت میں چمک پائی جاتی تھی اور معلوم دیتا تھا کہ آدمی کے اندر کام کرنے کا جذبہ کس قدر تیز، سودمند اور قابلِ قدر ہے۔

(الشجاع، صفحہ ۲۷)

ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری زورؔ:

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے میں ۳۲ سال سے واقف ہوں۔ وُہ اُس وقت اورنگ آباد ہائی اسکول کے پرنسپل تھے اور انجمن ترقیٔ اُردو کے مُعتمد۔ وہاں مَیں اُن کا مہمان بھی رہ چکا ہوں اور جب جامعہ عثمانیہ میں وہ اُردو کے پروفیسر ہوئے تو میں اُن کا مددگار سالہا سال تک رہا۔ اُن کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور جلال وجمال دونوں قسم کے جلوے میری نظر میں ہیں۔ وہ اپنی دھن کے پکّے اور کام کے رسیا ہیں۔ یہ اُن کی ایسی خصوصیت ہے جس کے باعث ان کو سرد وگرم زمانہ سے دوچار ہونا پڑا۔ میرے خیال میں اُن کی زندگی کا وہ دور جو اورنگ آباد میں گزرا ان کی حیاتِ مستعار کا سنہرا حصّہ ہے۔ حیدرآباد میں وہ اپنے اثر و اقتدار کے نقطۂ عروج تک پہنچ چکے تھے اور یہاں سے روانگی کے بعد قسم قسم کی پریشانیوں اور اُلجھنوں میں پھنس گئے۔ اُردو بولنے والی قوم اپنے محسنوں کے عیب دیکھتی ہے، ہُنر اس کو نظر نہیں آتے اور نظر آتے ہیں تو صاحبِ ہنر کے گزر جانے کے بعد۔ مولوی عبدالحق صاحب میں عیب بھی ہیں اور ہر انسان میں ہوتے ہیں، مگر اُن کے ہُنر عیب پر بھاری ہیں اور اگر ان کا دسواں حصّہ بھی کسی اور کو مل جائے تو اُردو کے دن پلٹ جائیں۔ وہ کئی لحاظ سے منفرد ہیں اُن کا ثانی کوئی نہیں

(الشجاع، صفحہ ۱۳، ۱۴)

پروفیسر عبدالقادر سروری:

مولوی عبدالحق صاحب کی زندگی اور کارناموں کا کوئی پہلو اُردو دنیا سے چھپا ہُوا نہیں ہے۔ ایک بزرگ کی حیثیت سے، جن کے ساتھ جامعہ عثمانیہ میں دس گیارہ سال کام کرنے کا مجھے موقع

ملا ہے، مولوی صاحب کا حق مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ میں سن شعور کو پہنچنے کے بعد سے مولوی صاحب کا قدر داں رہا ہوں اور جب سے تحریر کے اچھے اور بہتر انداز کو سمجھنے کی صلاحیت مجھ میں پیدا ہوئی، ان کے لکھنے کے انداز کا جادو مجھ پر حاوی رہا ہے۔ مولوی صاحب کا اسلوب تحریر ایک مخصوص آہنگ رکھتا ہے۔ اس کی سادہ پُرکاری اور جملوں اور فقروں میں چھپے ہوئے لطیف اور ثقہ طنز و مزاح کی وجہ سے، اُن کی تحریروں کو بار بار پڑھنے کے بعد بھی سیری نہیں ہوتی۔ افسوس ہے کہ ایسے نفیس اسلوبِ تحریر کے مالک کو تنظیمی کاموں سے اتنی فرصت نہ مل سکی کہ وہ تنقید سے ہٹ کر طبع زاد تصانیف کے لیے بھی کچھ وقت دے سکتے، جو اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہوتیں — مولوی صاحب کے اسلوبِ تحریر کی طرح اُن کے خط یا اُن کی لکھت کا انداز بھی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ اگر لکھت سے انسان کے مذاق کا اندازہ ہو سکتا ہے تو مولوی صاحب کے لکھنے کا مخصوص انداز ان کی نشو و نما پائی ہوئی جمالی حس کو ظاہر کرتا ہے، مولوی صاحب کے اثر میں جو لوگ آئے ہیں اُن میں سے اکثر لوگوں نے ان کے لکھنے کے انداز کا تتبع کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے — اُردو کی محبت کو مولوی صاحب اسلام کا ایک رکن سمجھتے رہے۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ مولوی صاحب کے ایک گہرے دوست اور ہم نام ڈاکٹر محمد عبدالحق مرحوم سابق صدر پبلک سروس کمیشن مدراس نے مجھ سے بیان کیا کہ مولوی عبدالحق نے اُن سے ایک دفعہ کہا تھا کہ میں تم کو سچا مسلمان سمجھتا ہوں، ڈاکٹر حق مرحوم نے جب اس کی پہچان پوچھی تو مولوی صاحب نے فرمایا "مسلمان کی تین علامتیں ہیں، ایک اُردو کی محبت......... اور یہ تینوں علامتیں تم میں موجود ہیں۔

محبت میں افراط و تفریط، ایک فطری بات ہے، اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ مولوی صاحب کبھی کبھی جادۂ اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہوں، خواہ وہ افراد اور حالات کی موافقت میں ہو یا مخالفت میں۔ یہ چیز مولوی صاحب کی شاید انفرادی شخصیت کا بھی نتیجہ ہے۔ وہ مخلص احباب کی بزم میں حریر و پرنیاں ہیں تو ایسے لوگوں کے حق میں جنہیں وہ پسند نہیں کرتے، تیغ جوہر دار بھی ہیں۔ نجی صحبتوں میں اُن کی گفتگو چشم بد دور باغ و بہار ہوتی ہے۔ اب ایسے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں جن

کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تکلّم کے وقت اُن کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ مولوی صاحب ہی گنے چنے لوگوں میں سے ہیں۔ طنز و مزاح کی چاشنی جو اُن کی تحریر کا ایک وصف ہے، اُن کی گفتگو میں بہت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔

اب وہ سماج باقی نہیں رہا جو سر شیخ عبدالقادر اور مولوی عبدالحق جیسے لوگوں کو پیدا کر سکے۔ اس لیے مولوی صاحب کی جیسی ہستیاں مغتنمات ہیں۔

(الشجاع، صفحہ ۱۴، ۱۵)

ڈاکٹر رضی الدّین صدیقی:

سر سید علیہ الرحمتہ کے زمانے سے لے کر آج تک مسلسل مولوی عبدالحق صاحب قبلہ پورے انہماک اور یکسوئی کے ساتھ اُردو کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی خارجی خدمات سے بڑھ کر مولوی صاحب کی وہ ادبی تحقیق، تخلیقی اور تنقیدی خدمات ہیں جو اُنھوں نے ادیب، انشا پرداز، نقّاد اور ماہرِ لسانیات کی حیثیت سے انجام دی ہیں۔ اُن کی شگفتہ اور برجستہ تحریریں، اُردو زبان کا انمول سرمایہ ہیں۔ — اُردو لغت، اور قواعد اور اصطلاحاتِ علمیہ پر مولوی صاحب نے جو مقالے اور کتابیں تحریر کی ہیں، وہ اوّلیت کا درجہ رکھتی ہیں — مولوی صاحب قبلہ نے اس طویل عرصے میں اُردو زبان کی حفاظت اور ترقی کے لیے جو انتھک کوشش کی ہے، اس کے مدِنظر ان کو اُردو کا "محسنِ اعظم" کہنا ہر طرح حق بجانب ہے۔

(الشجاع، صفحہ ۱۷)

پروفیسر حمید احمد خاں:

بابائے اُردو کی شخصیت ہمارے درمیان ایک اُصولِ زندگی اور ایک عظیم الشّان قومی ادارے کا مقام حاصل کر چکی ہے۔ ہماری طرف سے اُن کی علمی، ادبی اور قومی خدمات کا اعتراف دراصل

قومی زبان کی ترویج و اشاعت کے بلند مقاصد سے خود اپنی وابستگی کا اعتراف ہے۔

(الشجاع، صفحہ ۲۱)

ڈاکٹر محمد حسن:

برعظیم ہند و پاک میں شاید ہی کسی فردِ واحد نے اُردو زبان کی بقا اور استحکام کے لیے اتنا کام کیا ہو جتنا مولانا عبدالحق نے کیا ہے۔ اُن کی زندگی اس بات کی عظیم مثال ہے کہ بڑے مقصد کی لگن کس طرح افراد کو عظیم بنا سکتی ہے۔ انھوں نے اُردو زبان کے مسئلے کو اپنی ذات کا مسئلہ بنا لیا اور اپنے نجی دکھ سکھ کو اسی عظیم مقصد کے تابع کر دیا جس صبر و استقامت کے ساتھ انہوں نے سیاسی مدّوجزر میں اپنی جدوجہد جاری رکھی وہ کارنامے سے کم نہیں۔ اس کے ساتھ انجمن نے صرف ایجی ٹیشن یا اُردو کے جائز حقوق کے منوانے تک ہی اپنے کام کو محدود نہیں رکھا بلکہ مولانا کی سرگردگی میں جو خود اپنی ذات سے ایک انجمن بلکہ ایک عظیم ادارہ کہے جانے کے مستحق ہیں، قدیم مخطوطات اور قیمتی ادبی اور تحقیقی سرمائے کی بازیافت کا کام بھی بڑی مستعدی سے کیا۔ مولانا نے اُردو کے تاریخی سرمائے کی بہت سی گم شدہ کڑیاں پھر سے دریافت کیں، بہت سے کھوئے ہوئے موتی پھر سے ڈھونڈ نکالے اور اس کے علاوہ اپنے سادہ سنجیدہ اور دل کش اسلوب سے انہوں نے حالی کے اندازِ تحریر اور سرسیّد احمد خاں کی روایت کو زندہ رکھا۔ اُن کی حیثیت صرف ایک مجاہد اور تحقیق کے لیے سرمایہ فراہم کرنے والے ہی کی نہیں ہے بلکہ ایک ایسے صاحبِ طرز انشاپرداز کی بھی ہے جس کے اعجاز رقم قلم نے ہر طرح کے خشک و تر مضامین کو اپنی سادگی اور پُرکاری سے ادبی حسن اور لطافت بخشی۔ مولانا کی زندگی ہم میں ہر ایک کو یاد دلاتی ہے کہ بے پناہ لگن، مقصد کی دُھن، استقلال اور ہر صورتِ حال میں مایوسی سے دامن چھڑا کر اُمید کی تابانی سے اپنے دل کو منوّر رکھنا ہی زندگی کی دلیل ہے اور یہی کامیابی کا راستہ ہے۔

(الشجاع، صفحہ ۱۹)

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی :

مَیں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ مجھے مولوی عبدالحق صاحب ایسی بزرگ شخصیت کی صحبتوں سے مستفید ہونے کے مواقع میسر آئے۔ مولوی صاحب بیک وقت اعلیٰ درجے کے محقق و نقاد اور بلند پایہ مقرر و انشاپرداز ہیں۔ قدیم اُردو آپ کا محبوب موضوع ہے۔ نایاب جواہر پاروں کو منظر عام پر لا کر مولوی صاحب نے زبان و ادب کی تاریخ کی نشاندہی کی ہے اور لسانیات کی گتھیاں بھی سلجھائی ہیں۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں مولوی صاحب ایک رہبر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس میدان میں قدم رکھنے والے ہمیشہ آپ کے صحیح اور سُلجھے ہوئے طریقۂ تلاش و تحقیق سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ مولوی صاحب کی اصولی زندگی کے مشاہدے، علمی تجربہ، علمی اعانت اور بزرگانہ شفقت سے میں نے حتی الامکان فائدہ اٹھایا ہے۔

(الشجاع، صفحہ ۲۰)

ڈاکٹر محمد شہید اللہ :

پاکستان اور ہندوستان میں کون ہے جو بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کو نہیں جانتا، ان کی علمی خدمات اور ایثار ایک ضرب المثل ہے۔ انجمن ترقیٔ اُردو ان کی ایک زندہ جاوید یادگار ہے۔ اس بزرگ سنی میں بھی آپ ایک نوجوان کی طرح صبح سے شام تک علمی تفتیش میں سرگرم رہتے ہیں۔ میں تہہِ دل سے اُن کی علمی خدمات کا مُعترف ہوں۔

(الشجاع، صفحہ ۲۲)

ڈاکٹر گیان چند :

بیسویں صدی میں اُردو زبان کی بقا اور اشاعت کے لیے "فنائی الاُردو" ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی ذاتِ گرامی وہی معنی رکھتی ہے جو اُنیسویں صدی میں سر سیّد کی۔ مولوی صاحب کی شخصیت ایک ادارہ

ہے۔ ایک سرچشمہ ہے، جس سے اُردو نوازی اور اُردو پروری کے متعدد دھارے پھوٹتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک فردِ ایک عظیم زبان اور ادب کی کتنی متنوّع خدمات کر سکتا ہے۔ اپنے نصب العین کی راہ میں یہ انتھک لگن، یہ تیز گامی ہم سب کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہے

(الشجاع، صفحہ ۲۱)

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی :

ڈاکٹر مولوی عبدالحق ایک فرد نہیں، ایک ادارہ ہیں۔ گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے میں اُردو زبان و ادب پر جو کچھ گزرا ہے اور اس نے ترقی کی جتنی منزلیں طے کیں اس سے مولوی صاحب کو اتنا قریبی تعلق ہے اور آپ کی ذاتِ گرامی کا اس عہد پر اتنا گہرا اثر ہے کہ تاریخ زبان و ادب نہ آپ کی ذات کو فراموش کر سکتی ہے اور نہ آپ کے احسانات سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ مولوی صاحب قبلہ ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد کے صحیح مصداق ہیں اور خادمِ زبان سے بڑھ کر محسنِ زبان و ادب اور پھر بابائے اُردو کے القاب کے حقیقی معنی میں مستحق۔ یہی نہیں آپ ماہرِ لسانیات، صاحبِ طرز ادیب اور محققِ کامل بھی ہیں اور جدید علمی تنقید کو ہمارے ثقافتی، ملی اور ادبی مزاج کے مطابق ڈھال کر صحیح راہ متعین کرنے میں بھی مثالی رُتبہ رکھتے ہیں۔

سرسید کی تقلید اور ان کی مخالفت نے اُردو ادب کو جو وسعت بخشی وہ سب کے سامنے ہے۔ نقال ہوں یا نقاد اور مقلد ہو یا مخالف، سب کی کارگزاریوں کا تعلق بلا واسطہ سرسید کی تحریک سے سمجھا گیا ہے اور ان تمام علمی و ادبی خدمات کا سہرا بجا طور پر سرسید کے سر باندھا گیا ہے، یہی حال مولوی صاحب قبلہ کا ہے — آپ کی خدمتِ زبان و ادب کی عمر اتنی ہی ہے جتنی موجودہ صدی۔ اس دوران میں آپ نے تحقیق، تنقید، تصنیف اور لسانی خدمت کی صورت میں جو شاندار، یادگار اور وقیع کارنامے انجام دیے ہیں، اُن سے کسی طرح کم درجہ نہیں ہے، ان اثرات کا جو اس ذیل میں آپ نے دوسروں پر ڈالے۔ ایسے کتنے ادیب، نقاد اور محقق ہیں جو مولوی صاحب قبلہ کی آغوشِ تربیت سے فیض پاکر یا تحریرو

سے تاثر لے کر ہمارے آسمانِ ادب کے درخشندہ ستارے بن چکے ہیں۔

مولوی صاحب کا خلوصِ عمل اور جوشِ عمل مثالی درجہ رکھتا ہے ـــــ تقسیم کے وقت آپ پر جو گزرا اُس کا آج صحیح اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں لیکن ۱۹۴۹ء کے اوائل میں، جب مجھے آپ سے لاہور میں نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا تو میں یہ دیکھ کر حیران تھا کہ آپ کے ارادوں میں ذرا سا بھی تنزلزل اور ضعف نہ تھا اور آپ کی ہمت اور حوصلے جوانوں کو مات کرتے تھے۔ انجمن ترقی اردو کو پاکستان میں دوبارہ ایک زندہ اور فعّال ادارہ بنا دیا، اس کے تمام شعبوں کو بہ ہمہ مشکلات پھر قائم کرنا اور جاری رکھنا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اُردو کالج قائم کرنا اور اسے صفِ اوّل کی بہترین درس گاہ بنا دینا، یہ سب ایسی باتیں ہیں جن کو سامنے دیکھ کر بھی سمجھنا مشکل ہے۔ مشکلے نیست کہ آساں نہ شود کہنے والے بہت ملتے ہیں، لیکن مولوی صاحب قبلہ کی طرح اس پر عمل کرنے والے شاذ ہیں۔

(الشجاع، صفحہ ۲۳-۲۴)

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ:

عبدالحق صاحب کو تو میں انے گنے مجاہدینِ ادب میں شمار کرتا ہوں، جن کی رہنمائی ہزاروں کو راہِ راست پر لائی اور جن کی کاوش اور جہد، متعدد طاقتوں سے نبرد آزمائی میں کامیاب رہی اور اُردو زبان و ادب کے لیے تائیدِ یزدانی ثابت ہوئی۔

(الشجاع، صفحہ ۲۶)

مولانا غلام رسول مہر:

مولانا عبدالحق کا اسمِ گرامی زبان پر آتے ہی ایک ایسی شخصیت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ زبان اور علم و ادب کی خدمت میں بسر کر دیا اور اس سلسلے میں بھی وہ پہلو بطورِ خاص پیشِ نظر رکھے جنھیں ملک و ملت کی تعمیر اور قومی ثقافت کی تزئین و تحسین میں بڑی اہم حیثیت حاصل

ہے۔ اُن کے کارنامے اس درجہ بلند، گراں مایہ اور پائیدار ہیں کہ آج پاک و ہند کے آسمان کے نیچے کوئی دوسرا شخص علم و ادب اور زبان کے دائرے میں اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور خیرہ ذوقی و اغراض جوشی کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اُس میں مولانا جیسے کسی فرد کا پیدا ہونا بہ ظاہر مشکل ہی نظر آتا ہے۔

انھوں نے اُس وقت اپنے آپ کو خدمت کے لیے وقف کیا جب دوسرے دائروں میں اُن کے سامنے ترقی و سربلندی، مال و ثروت، جاہ و منصب اور عزت و شہرت کے بہترین سامان موجود تھے اور وہ جلد سے جلد، اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ فارغ البالی کا، حاصل کر سکتے تھے۔ واضح رہے کہ زبان یا علم و ادب کے دائرے میں اس وقت کوئی کشش اور کسی نوع کی گیرائی نظر نہ آتی تھی۔

اِس واقعے پر کم و بیش نصف صدی کے لیل و نہار گزر چکے ہیں۔ آج مولانا اور انجمن ترقی اُردو ہم معنی اور مُترادف بن چکے ہیں۔ انجمن کے بغیر مولانا کا تصوّر اور مولانا کے بغیر انجمن کا تصوّر سراسر اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ اُن کی زندہ اور پایندہ رہنے والی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ کوئی چاہے بھی تو انھیں گِنا نہیں سکتا۔ دولتِ آصفیہ میں جامعہ عثمانیہ اور دار الترجمہ کے ذریعے سے تیس سال کے اندر جو کچھ ہوا، اُس کے لیے سعی و کوشش اور رہنمائی میں سب سے بڑا حصّہ مولانا ہی کا ہے۔ انجمن ترقیٔ اُردو ہند اور انجمن ترقی اُردو پاکستان انھیں کی علمی سرگرمیوں کے دو نقش ہیں، پھر انھوں نے تراجم، اصطلاحات، لغت اور نادر کتابوں کی اشاعت کا جو انتظام کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس ایک وجود کا کام، ایک پوری انجمن اور ایک بہت بڑی جماعت کے کام سے بھی بہ لحاظِ کمیت و کیفیت بہت زیادہ ہے۔ وہ ایک ایسے جلیل القدر اور نادر الوجود فرد ہیں جنھوں نے اِس دنیا کی پوری متاع اپنے محبوب ترین مقصد کے لیے بے دریغ قربان کر دی۔

محترم مولانا صاحب نہ کبھی کسی اعزاز کے طلب گار رہے اور نہ اُن کی ذاتِ گرامی کسی اعزاز کی محتاج ہے۔ ہم لوگ اُن کی جتنی بھی عزت اور جتنا بھی احترام کریں گے، وہ اس جذبۂ ایثار اور اس شانِ استقامت کا اعزاز و احترام ہو گا جس میں مولانا کے وجود کو آج پاک و ہند میں یگانہ اور منفرد مقام حاصل ہے۔ (الشجاع، صفحہ ۱۲-۱۳)

میاں بشیر احمد:

بابائے اُردو نے جس ہمت و استقلال سے ہماری قوم کے لئے کام کیا ہے، ہماری تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ اُن کی زندگی ہمارے لیے ایک روشن ترین مشعلِ راہ ہے۔

(الشجاع، صفحہ ۱۶)

شاہد احمد دہلوی:

مولوی عبدالحق صاحب کی ساری عمر اُردو کی خدمت میں گزری ہے۔ اس صدی میں کئی ایسے موقعے آئے کہ مولوی صاحب سینہ سپر نہ ہو جاتے تو اُردو کہیں کی نہ رہتی۔ کوئی ۲۵ سال اُدھر کی بات ہے کہ گاندھی جیسے بااثر شخص نے اُردو پر زبردست حملہ کیا تھا۔ اُس وقت مولوی عبدالحق صاحب اگر خم ٹھونک کر سامنے نہ آجاتے تو گاندھی نے میدان مار لیا ہوتا ــــــ مولوی صاحب نے تن، من، دھن سے اُردو کی خدمت کی ہے۔ انجمن ترقیٔ اردو مولوی صاحب کا دوسرا نام ہے۔ اُردو کے اِس عظیم ادارے کا نام تاریخِ ادب میں سنہرے حروف میں لکھا جائے گا اور مولوی صاحب کا اسمِ گرامی مجاہدینِ اُردو میں سرِ فہرست جگہ پائے گا۔

(الشجاع، صفحہ ۱۸)

شاد عارفی:

کس کافر کو اس سے انکار ہو گا کہ تاریخِ ادب میں مولانا عبدالحق کی خدمات ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ اگر ہم مولانا کو شہرِ ادب تصور کریں تو ظاہر ہے کہ آپ کے ڈانڈے ایک طرف تو سرسید اور حالی سے ملتے ہیں اور دوسری طرف عہدِ حاضر میں شامل ہیں ہم نے بابائے اُردو کو جوئے شیر لانے کے لیے اُردو کے کوہِ بے ستون پر تیشہ لیے گھومتے دیکھا ہے۔ ادب کے نجد میں لیلےٰ لیلےٰ پکارتے سنا ہے، چلچلاتی دھوپ اور

کڑکڑاتے جاڑوں میں اس مردِ غازی کو سرگرمِ عمل و سفر پایا ہے گویا موصوف کا مقصد ہی یہی ہو، اور ہے بھی یہی ــــ

(الشجاع، صفحہ ۲۴ ــ ۲۵)

خواجہ محمد شفیع دہلوی :

مولانا محترم عبدالحق کے نقشِ قدم ہمارے واسطے واجب التعظیم ہیں۔ مولانا موصوف عہدِ ماضی کے بزرگوں کا نمونہ ہیں۔ وہی شرافت، وہی وضع داری، وہی ادا۔ موصوف ہمارے اور ماضی کے درمیان کڑی ہیں۔

(لورس، کراچی، صفحہ ۱۹)

سلام مچھلی شہری :

جدید دور میں زبانِ اُردو کے معماروں، بلکہ رہنماؤں میں مولوی عبدالحق کا بہت بڑا مقام ہے تغیرِ حالات کے باوصف وہ زبان و ادب کے عظیم رہنما رہے ہیں اور رہیں گے۔

(الشجاع، صفحہ ۲۷)

ڈاکٹر سلامت اللہ :

مولوی عبدالحق صاحب کی ساری زندگی اُردو زبان اور ادب کی چمن بندی میں صرف ہوئی ہے۔ یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اگر آج کوئی ایک شخص ہندوستان اور پاکستان میں ایسا ہے جس نے اردو کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے تو مولوی صاحب کی ذات ہے۔ مولوی صاحب نے اس مقصد کے لیے اپنا سب کچھ وقف کر دیا۔

(الشجاع، صفحہ ۲۲)

عرشؔ ملسیانی:

عزم کر لینا تو بڑی بات نہیں، لیکن اس عزم کو زندگی بھر پالنا بڑا کام ہے۔ نوجوانوں کو مولانا کی زندگی سے سبق لینا چاہیے۔ موصوف کے تنقیدی نگارشات، ہم عصروں کا ذکر، انگریزی اُردو لغت کی تدوین ایسے ادبی کارنامے ہیں، جو فراموش نہیں کیے جا سکتے ـــــ

(الشجاع، صفحہ ۲۹)

عادل رشید:

اُردو جاننے والا کوئی فرد اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اُردو کو موجودہ رنگ روپ دینے میں مولوی صاحب کی کوششوں کو بہت زیادہ دخل ہے۔ ایک بلند پایہ مُحقّق اور ایک عظیم نقّاد کی حیثیت سے مولوی عبدالحق صاحب حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کے خُطبات و مُقدمات، اُن کی ژرف نگاہی اور تبحّرِ علمی کے آئینہ دار ہیں۔ یہ مولوی صاحب ہی کی سعی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اُردو کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں فخر سے پیش کر سکتے ہیں۔

(الشجاع، صفحہ ۲۸)

کرشن چندر:

جو کام گاندھی جی نے ہندوستان کے لیے، مسٹر جناح نے پاکستان کے لیے کیا، وہ کام اُردو کے لیے مولوی عبدالحق نے کر دکھایا۔ بلاشبہ عبدالحق صاحب نے اپنے خون سے اس زبان کو سینچا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اُردو کے شیدائی اُن کے کام کو آگے بڑھائیں گے۔

(الشجاع، صفحہ ۱۷)

نریش کمار شاد :

اُردو چونکہ ہندو اور مسلم دونوں کے مشترکہ کلچر کی خوبصورت یادگار ہے ، اور بابائے اُردو اس زبان کے وہ عظیم محسن ہیں جن کی اُردو... سرگرمیوں کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی ، اس اعتبار سے وہ ہم سب کے لیے قابلِ احترام ہیں۔ (الشجاع، صفحہ ۲۸)

پروفیسر جہاں بانو نقوی :

محترم مولانا عبدالحق پر لکھیے تو وہ جن کی اُن سے ملاقات ہو، ملنا جلنا ہو، جان پہچان ہو، یہاں نہ یہ، نہ وہ — مولوی صاحب کی ادبی ولسانی خدمات نے انہیں ایک ادارے کی شکل دے دی ہے۔ کوئی خوش قسمت آپ سے مل کر متأثر ہوتا ہے اور ایسے کتنے غائبانہ عقیدت مند میری طرح ہوں گے، جن کی تمنا حسرت بن گئی۔ (الشجاع، صفحہ ۲۹)

گوپی ناتھ امن :

مولانا کا دم غنیمت ہے۔ ایک نقاد اور محققِ زبان کی حیثیت سے ان کا پایہ بہت بلند ہے اور پھر اُن کی انتھک کوشش اور لگن کا تو کہنا ہی کیا ہے — (الشجاع، صفحہ ۲۸)

پروفیسر پرتھوی ناتھ شرما :

اردو زبان پر ڈاکٹر عبدالحق کا بہت بڑا احسان ہے۔ اُنہوں نے اردو زبان کی بطور ایک زبان داں ہی نہیں، اس کی بقا اور ارتقا کے لیے ایک منتظم، سرگرم کارکن اور انجمن ترقی اردو کے بانی کی حیثیت سے بھی قابلِ قدر و احترام خدمات انجام دی ہیں۔ اردو زبان کے ذریعے ڈاکٹر عبدالحق نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کی خدمت کی ہے اور یہ ایک — قابلِ فخر بات ہے۔ (الشجاع، صفحہ ۲۶)

آپ بیتی

مولوی عبدالحق کی کہانی، خود اُن کی زبانی

مُرتّبہ:

ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن

"آپ بیتی" کے عنوان سے مولوی عبدالحق صاحب کی کہانی، خود اُن کی زبانی مُرتّب کی گئی ہے۔ اِس کام میں مولف سیّد معین الرحمٰن صاحب نے مولوی صاحب کی ساری تحریروں کو نظر میں رکھا ہے اور اقتباسات میں ایسا منطقی ربط پیدا کر دیا ہے کہ وہ سچ مُچ مولوی صاحب کی خود نوشت بن گئی ہے ــــ پھر چونکہ مولّف نے ماخذ کے حوالے بھی ہر جگہ نہایت احتیاط سے درج کر دیئے ہیں، اِس لیے اس کی حیثیت مولوی صاحب سے مُتعلق ایک مستند دستاویز کی سی ہو گئی ہے ــــ"

ــــ نیاز فتحپوری

مُرتّب سیّد معین الرحمٰن صاحب نے بڑی تلاش اور دیدہ ریزی کر کے مولوی عبدالحق مرحوم کی آپ بیتی، مرحوم ہی کے نوشتوں سے چُن کر جمع کر دی ہے ــــ"

ــــ مولانا عبدالماجد دریابادی

"آپ بیتی" (مولوی عبدالحق) خوب ہے، نہایت اہم اور نہایت مفید ــــ"

ــــ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

"مولوی عبدالحق صاحب کی خود نوشت آپ بیتی کی ترتیب، ایک اُپج ہے۔ اِسے اِس مجموعے میں شامل کرنے سے اس کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ــــ ڈاکٹر شوکت سبزواری

○

(۱)

میں نے[1] جب ہوش سنبھالا تو مسلمانوں میں کچھ ہل چل نظر آئی۔ مسلمان شرفا خصوصاً بڑے بوڑھے اپنے دیوان خانوں میں بیٹھتے تو کسی نہ کسی طرح علی گڑھ کالج یا سیّد احمد خاں کا ذکر نکل آتا۔ سیّد احمد خاں اس زمانے میں مسلمانوں کے ہر طبقے میں موضوعِ بحث تھے۔ ان کی نسبت کفر و الحاد کا فتویٰ تو عام تھا۔ مولوی صاحبان اس کے ذکرِ عزیز کو اپنے وعظوں، بحثوں، تحریروں اور تقریروں میں طرح طرح سے مزے لے لے کر بیان کرتے اور تخیّل کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیتے۔ سننے والے اور معتقدین ان باتوں پر اپنی طرف سے خوب خوب حاشئے چڑھاتے، کوئی کہتا گردن مروڑی مرغی کھاتا ہے اور حلال حرام میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ کوئی کہتا اس نے اپنا سر بیچ دیا ہے، مرنے کے بعد انگریز اس کا سر لے جائیں گے .... یہ سب کچھ تھا لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ ان کی دانش مندی کے سب قائل تھے۔ سر بکنے کا قصہ اسی بنا پر مشہور ہوا۔

میں یہ واہی تباہی سنتا رہتا تھا، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا اتفاق سے ایک روز میرے ایک ہم جماعت مجھے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں میں نے "تہذیب الاخلاق" کے پرچے دیکھے اور پڑھنے شروع کئے۔ اس میں ایسا دل لگا کہ اس کے بعد میں اُن سے پرچے مانگ لاتا اور پڑھتا رہتا۔ اب میری آنکھیں کھلیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ "تہذیب الاخلاق" کا مطالعہ مجھے کھینچ کر علی گڑھ لے گیا اور میں کالج کے اسکول میں داخل ہوگیا پہلے کانوں پہ تکیہ تھا اب آنکھوں نے جلوہ دکھایا لیکن دور سے دیکھنے اور قریب سے دیکھنے میں فرق ہے۔ جب میں کالج میں پہنچا تو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آخری دو سال میں زیادہ قربت نصیب ہوئی اور سیّد علیہ الرحمہ کو کام کرتے، ہم کلام ہوتے، اُٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے، بورڈنگ ہاؤس کے کمروں کی پیمائش کرتے، مسجد میں نماز پڑھتے، جلسوں میں تقریر کرتے اور گرجتے دیکھا، ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

میں[2] جب اوّل روز مدرسۃ العلوم مسلمانانِ ایم او کالج علی گڑھ کے اسکول میں داخل ہوا اور بورڈنگ ہاؤس

---

[1] رسالہ نورس، مجلّہ انجمن بنی بلاغ اسکول کراچی، جولائی ۱۹۶۰ء، صفحہ ۲۱

[2] قومی زبان، کراچی ۱۶ اگست ۱۹۶۰ء، صفحہ ۵

میں پرنسپل صاحب کی عنایت سے کمرہ مل گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ نئی دنیا میں آگیا ہوں۔ وہاں کے طالبعلم ان کی عادات اور شرارتیں اور مصروفیات وہاں کے اساتذہ، وہاں کا ڈائننگ ہال اور اس کے کھانے، دنیا بدل گئی پر ان کا مزہ کبھی نہ بدلا مسجد اور نمازیں اور مؤذن کی کڑک دار آواز یہ سارا ماحول میرے لیے بالکل نیا اور عجب سا تھا۔ ۱۸۸۶ء یا ۱۸۸۹ء کی بات ہے اس وقت طالب علموں کی تعداد تین سو سے زیادہ نہ تھی طالب علم ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر علاقے کے تھے۔ بعض اوقات ہندوستان کے باہر کے بھی آکر داخل ہو جاتے تھے اور کوئی صوبائی امتیاز باقی نہ رہتا۔ سب اُردو بولتے تھے اور بے تکلف بولتے تھے۔ میرے ایک ہم جماعت بنگالی چاٹگام کے اس قدر صاف اور بے تکلف اُردو بولتے تھے اور ان کا لہجہ بھی ایسا تھا کہ میں ابتدا میں یہی سمجھتا رہا کہ یوپی کے کسی مقام کے رہنے والے ہیں۔ ایک خاص بات جو مجھے یہاں نظر آئی وہ قومیت کی مہک تھی جو کسی دوسری جگہ نہیں پائی جاتی تھی۔ یہ کالج کے بانی سر سید احمد خاں کا طفیل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں میں قومیت کا احساس پیدا کیا اور اس احساس کو تقویت اُن اکابر قوم سے پہنچی تھی جو کسی نہ کسی تقریب سے کالج میں یا سید صاحب کے پاس آتے رہتے تھے۔

انٹرینس (جسے آج کل میٹرکولیشن کہتے ہیں) کے امتحان میں کامیابی کے بعد میں کالج کی جماعتوں میں چلا گیا۔ اسکول میں سب مُعلم ہندوستانی تھے۔ سوا ہیڈ ماسٹر ہورسٹ کے جو بلند قامت گراں ڈیل شخص تھے اور کسی فوج کے کرنیل معلوم ہوتے تھے۔ سیکنڈ ہیڈ ماسٹر ولایت حسین تھے جو بڑے محنتی اور فرض شناس تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی انہیں کے ذمّے تھی اور بورڈنگ ہاؤس ہی کے کمرے میں رہتے تھے۔ ان کے ذمّے اور بھی کئی کام تھے۔ سر سید، محسن الملک اور دیگر اکابر ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ میرے حال پر بڑی مہربانی فرماتے۔ وہ ہماری جماعت کو ریاضی بھی پڑھاتے تھے۔ ایک دن میں کسی وجہ سے ان کا کام کر کے نہ لایا۔ وہ بہت خفا ہوئے اور فرمانے لگے: "میں تو تمہارا بھاٹ بنا ہوا ہوں، اور جگہ جگہ تعریف کرتا پھرتا ہوں اور تم ہی میرا کام کر کے نہیں لاتے۔" مجھے بہت شرم معلوم ہوئی اور اس کے بعد سے میں نے اپنے کام میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ میں کبھی کسی کھیل میں شریک نہ ہوا۔ مسٹر بیک کئی بار مجھے اپنے

ل قومی زبان، کراچی ۱۶؍اگست ۱۹۶۰ء، صفحہ ۶

کمرے سے پکڑ کر کھیل کے میدان میں لے گئے۔ میں ساتھ ہولیتا۔ فیلڈ میں پہنچ کر غچہ دے کر دوسری طرف نکل جاتا۔ یونین کے الیکشن میں بڑا ہنگامہ ہوتا۔ میں یونین کے جلسوں اور تحریکوں سے ہمیشہ الگ رہا۔ کالج میں کئی انجمنیں تھیں۔ "لجنتہ الادب" وغیرہ۔ میں نے ان میں شرکت نہ کی۔ البتہ "اخوان الصفا" میں جس کے بانی پروفیسر آرنلڈ تھے دو ایک مضمون پڑھے۔ ایک مضموں میں نے سینٹ پال پر پڑھا۔ اُس دن سے لڑکے مجھے سینٹ پال کہنے لگے۔ مطالعہ کا شوق مجھے ابتدا سے تھا۔ تعطیلوں میں طالب علم اپنے اپنے وطن چلے جاتے تھے۔ چھٹیوں کے دنوں میں پڑھنے کے لیے کچھ طالب علم لائبریری سے کچھ کتابیں مستعار لے جاتے تھے یہ کام پروفیسر آرنلڈ کے سپرد تھا۔ میں بہت سی کتابیں مختلف نوعیت کی انتخاب کرتا تو آرنلڈ صاحب کہتے "تمہیں بڑی ہوس ہے۔ اتنی ساری کتابیں کیسے پڑھوگے"۔ وہ ٹھیک کہتے تھے۔ سب کتابیں کہاں پڑھ سکتا تھا۔ بعض ویسی کی ویسی ہی واپس لے آتا۔

کالج میں تمام پروفیسر سوا عربی، فارسی، سنسکرت اور ریاضی کے انگریز تھے۔ فارسی، عربی کے پروفیسر مولانا شبلی اور مولانا عباس حسین تھے۔ ریاضی کے بابو مکرجی۔ مولانا شبلی شاعر، ادیب اور مورخ تھے۔ اُن کی جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہوتا تھا۔ وہ موقع موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف یا تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ درس کا حق ادا ہو جاتا تھا۔ عباس حسین نرے مُلّا تھے، ادبی ذوق سے عاری۔ البتہ ضلع جگت کے استاد تھے۔ ضلع بولنے سے کبھی نہ چوکتے اور جو کوئی اُن کے جواب میں ویسا ہی بول جاتا تو باغ باغ ہو جاتے۔ ایک بار کالج کی تنخواہوں میں بہت دیر ہوگئی مولوی شبلی سے بہت شکایت کرنے لگے کہ تنخواہ نہ ملنے سے بہت تکلیف ہے۔ مولوی شبلی نے کہا "آج کل روپے کا بہت توڑا ہے"۔ روپے کے ساتھ توڑے کا لفظ سن کر اس قدر خوش ہوئے کہ ساری تکلیف بھول گئے۔ ریاضی کے پروفیسر بہت ہی شریف اور نیک انسان تھے۔ سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے انٹرمیڈیٹ میں میرا ایک مضمون ریاضی بھی تھا اس لیے مجھے ان سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ حاضری لیتے وقت میرا نام "آبدل ہوک" کہہ کر پکارتے۔ بنگالی زبان میں ہر لفظ گول ہو جاتا ہے۔ گھڑی گھوڑی اور بنگالی بونگولی ہو جاتا ہے۔ حق بھی ہوک ہو جاتا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ کی حیثیت کالج میں خاص بلکہ

امتیازی تھی۔ وہ سچے علم کے طالب اور علم دوست تھے۔ میں نے کالج میں اُنہیں کبھی انگریزی لباس میں نہ دیکھا۔ وہ کالج میں عربی لباس میں آتے تھے۔ سر پر عمامہ، بدن پر عبا و قبا اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا اور ہاتھ میں موٹے سے دستے کی چھتری لیے جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہوئے ٹھیک وقت پر آجاتے راستے میں کوئی دیکھے تو یہ معلوم ہو مُلّاجی کسی مسجد میں درس دینے جارہے ہیں۔ کبھی کبھی تیسرے پہر مغرب سے قبل میرے کمرے میں آجاتے اور مجھے سیر کے لیے ساتھ لے جاتے۔ راستے میں پوچھتے کہ "آج کل کیا کر رہے ہو؟ کیا کچھ لکھ رہے ہو؟" جب میں بتاتا کہ فلاں موضوع پر لکھ رہا ہوں تو اس کے متعلق مجھ سے بحث کرتے اور بعض کتابوں کی نشاندہی کرتے۔ ایک بار ایسی ہی سیر میں جب ان کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ میں بابیوں کے مذہب پر کچھ لکھ رہا ہوں تو پوچھا مجھے اسکا خیال کیسے پیدا ہوا اور اس کے لیے مجھے مسالہ کہاں سے ملا؟ دوسرے دن انہوں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے چند نمبر بھیجے جن میں پروفیسر براؤن نے بابی مذہب پر مضامین لکھے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ میں عالمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں پائی جاتی تھیں۔

ہمارے پرنسپل مسٹر تھیوڈر بیک چھریرے بدن کے بڑے مستعد، تیز آنکھیں چمکتی ہوئی، ذہین شخص تھے۔ اس منصب کے لیے ان کا انتخاب سید محمود نے کیا تھا کیمبرج یونیورسٹی کے ممتاز گریجوایٹوں میں سے تھے اور وہاں کی یونین کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ جب یہ کالج میں آئے تو بالکل جوان تھے اور ہم سے خوب گھل مل گئے۔..... کچھ عرصے کے بعد جب اُنہیں ہندوستان کی ہوا لگی اور یہاں کی تاریخ و حالات سے زیادہ واقفیت ہوئی تو رفتہ رفتہ اُن کا جھکاؤ سیاست کی طرف ہوتا گیا۔ اس زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کا ملک بھر میں چرچا تھا۔ سر سید کی مخالفت سے ملک میں ایک عجیب ہنگامے کی حالت پیدا ہوگئی تھی۔..... یہ ایک طویل بحث ہے یہاں اس موضوع پر کچھ لکھنا بے موقع ہوگا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، مسٹر بیک کو یہ زرّیں موقعہ ہاتھ آیا اور اُنھوں نے نیشنل کانگریس کے خلاف خوب زہر اگلنا شروع کیا۔ مسلمان بہت خوش ہوئے۔ مسٹر بیک میں کچھ کچھ انیگلو انڈین رنگ پیدا ہو چلا تھا۔ وہ بجائے مائی آرڈر کے مائی حکم فرمانے لگے تھے۔ حکم میں جو تحکمانہ شان ہے وہ آرڈر میں کہاں

وہ زمانہ تھا کہ انگریز اپنے آپ کو لاٹ صاحب سمجھتا اور ہر ہندوستانی کو اپنی رعایا۔ جب تک سرسید زندہ رہے یہ دبے دبے رہے ان کے مرنے کے بعد یہ کھُل کھیلے اور کالج کے ٹرسٹیوں تک کو غلِ مکتب سمجھنے لگے اور ان پر حکم چلانے لگے۔ گورنمنٹ میں ان کا رسوخ تھا اور اعلیٰ حکام سے راہ و رسم تھی، اس لیے ٹرسٹی بھی ان سے ڈرتے تھے۔ میرا یہ گمان ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ غلط نہیں کہ وہ مسلمانوں سے اپنی قوم کے کام لینا چاہتے تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے ہو کر آئے۔ کرزن زبردست امپریلسٹ تھے ان کے دماغ میں شہنشاہیت کی بو سمائی ہوئی تھی۔ مسٹر بیک ان سے جا کر ملے۔ کرزن بھی کیمبرج کے نامور گریجویٹ تھے اور یونیورسٹی یونین کے صدر رہ چکے تھے۔ بیک کرزن کی گوں کے آدمی تھے۔ یہ شملے میں کرزن سے پینگیں بڑھا رہے تھے کہ وہاں ہیضے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ اگر جیتے رہتے تو کرزن کی حکومت میں بڑے آدمی ہوتے اور بڑا مقام حاصل کرتے۔ اس خیال کے آتے ہی میرا دل کانپ اٹھتا ہے کہ نہ معلوم اس وقت مسلمان کا کیا حشر ہوتا۔ ایک مشہور ہندی دوہے کا ٹکڑا " نا گھر میرا نا گھر تیرا، چڑیا رین بسارے رے" انہیں بہت پسند تھا اور اکثر پڑھا کرتے تھے۔ یہی اُن کی قبر پر کندہ ہے۔

ابھی مجھے کالج میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک دن مَیں کیا دیکھتا ہوں کہ وکٹوریہ گیٹ سے داخل ہوتے ہی پکی بارک شروع ہوتی ہے اُس کے برآمدے میں کچھ طالب علم کھڑے ہیں اور ان کے بیچ میں مسٹر بیک تشریف رکھتے ہیں۔ طالب علموں کے ہاتھوں میں لمبی لمبی فردیں تھیں جن پر ناموں کی فہرست تھی۔ طالب علم یہ فہرست مسٹر بیک کو دکھا رہے تھے۔ یہ جُمعہ کا دن تھا۔ طالب علموں نے شہر کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی تھی۔ اس زمانے میں سرسید انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف مسلمانوں کے ناموں کی فہرستیں انگلستان کی پارلیمنٹ کو بھیج رہے تھے۔ یہ طالب علم مسٹر بیک سے کہہ رہے تھے کہ ہم نے ان فردوں پر نمازیوں سے یہ کہہ کر دستخط لیے کہ ہندو "گاؤ کشی" کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں اور قانون پاس کرانا چاہتے ہیں، ہم اس کے خلاف گورنمنٹ میں معروضہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر بیک یہ سُن کر ہنسے مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی اور افسوس ہوا کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ذمہ دار انگریز ایک ایسے

فعل پر خوشی کا اظہار کر رہا ہے جو دیانت اور راستی کے خلاف ہے...... انگریز بلاشبہ معاملات میں بہت احتیاط اور دیانت سے کام لیتا ہے لیکن جہاں قومی مفاد کا معاملہ آتا ہے تو ضمیر، انصاف اور راستی کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ہمیں اس کا ایسا تلخ تجربہ ہوا ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان کے بعض سرحدی اضلاع کے تنازعہ کے چکانے کے لئے انگلستان کی ہائی کورٹ کے ایک جج کو حاکم بنایا گیا اور یہ قرار دیا گیا کہ یہ جو فیصلہ کرے گا وہ ہر دو فریق کو تسلیم کرنا پڑے گا اور اس کے خلاف کوئی اپیل نہ ہو سکے گی۔ مسٹر جناح کا خیال تھا کہ مسٹر ریڈکلف انگلستان کی ہائی کورٹ کا جج ہے وہ کبھی ایسی بات نہیں کرے گا جو راستی اور انصاف کے خلاف ہو۔ اس نے جو فیصلہ کیا وہ ہمارے سامنے ہے۔ پاکستان اسے اب تک رو رہا ہے اور نہ معلوم کب تک روتا رہے گا۔ بعد میں قائداعظم نے اس فیصلے کے خلاف بہت کچھ سخت سست لکھا اور کہا اور لعنت ملامت کی لیکن کیا ہوتا ہے زبان دے چکے تھے ماننا ہی پڑا۔ لہ

مسٹر بیک مسلمانوں کی سرشت سے خوب واقف ہو گئے تھے اور اُن کے لبھانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے مثلاً کبھی عبا اور ترکی ٹوپی پہنے آ پہنچے یا کانفرنس کے جلسے میں تقریر کرتے کرتے مسدسِ حالی کا کوئی بند انگریزی لہجے میں پڑھتے تو مسلمان خوشی سے اُچھل پڑتے۔ ان کا پورا نام تھیوڈر بیک تھا مسلمان تہور بیگ کہنے لگے۔ البتہ ایک بات ضرور کہوں گا کہ انہیں طالب علموں سے بہت ہمدردی تھی، اُن کی بہبودی کے لیے یا نوکری دلانے میں کوشش کرتے یا جب کبھی پولیس یا ریلوے اسٹیشن والوں سے لڑکوں کا جھگڑا ہو جاتا اور مارپیٹ کی نوبت آجاتی تو مسٹر بیک ہمیشہ اپنے طالب علموں کی حمایت کرتے۔

کالج جب نیا نیا قائم ہوا تو سرسید کا یہ معمول تھا کہ.... صبح کو کالج کی عمارت، باغ وغیرہ دیکھنے آتے۔ اسی زمانے میں جب کہ اسٹریچی ہال قریب تکمیل کے تھا اور آس پاس کے کمروں کی ابھی بنیادیں ہی پڑی تھیں ایک دن میں اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم مسجد ردیہ کے ایک کمرے کی بنیاد پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں سید صاحب تام جھام میں آتے ہوئے نظر آئے، مسجد کی سیڑھیوں کے پاس اُتر گئے۔ ہمیں جو دیکھا تو پلٹ کر مجھے فرمایا "اس کے ساتھ مت پھرا کرو، تم کو شیعہ کر لے گا۔" میں نے کہا "حضرت اب تو لوگ شیعہ رہے نہ سنی۔" امیر اشاہ

لہ قومی زبان، کراچی، ۱۶/ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۵

ٹہ چند ہم عصر، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۹ء، صفحہ ۲۴۰

اس مذہب کی طرف تھا جسے عام لوگ نیچری کہتے اور اُن سے منسوب کرتے تھے)، فرمانے لگے۔ "اسے ایسا بنالو تو جانوں"۔

سیّد محمود کی چیف جسٹس (دہائی کورٹ الہ آباد) سے اَن بن ہوگئی تھی اور استعفیٰ دے کر علی گڑھ آگئے تھے۔ ایک بار جو سیّد صاحب کے پاس گیا تو مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ کوٹھی میں سب سے بڑا کمرہ یہی تھا معلوم ہوا کہ وہ چیف جسٹس کا جواب لکھ رہے ہیں۔ چیف جسٹس نے ان کے خلاف گورنمنٹ میں ۵۰ صفحے کی رپورٹ بھیجی تھی۔ سیّد محمود نے اس کی تردید میں پانچ سو صفحے کا جواب لکھا۔ میں اس میں کبھی کبھی شریک ہوجاتا تھا مثلاً کسی حوالے کے تلاش کرنے میں یا کسی اقتباس کے نقل کرنے میں۔ تعلیم پر کتاب بھی انہوں نے اسی زمانے میں تالیف کی ایک اور اچھی اور مفید تالیف بھی شروع کی اور وہ "محمڈن لا" تھی۔ اس کے پروف کئی بار میرے سامنے آئے۔ میں روزانہ سہ پہر کو سیّد محمود کے پاس چلا جاتا جس روز دیر ہوجاتی تو آدمی کو بھیج کر بلا لیتے۔ رات کے کھانے کے لیے روک لیتے اس طرح کوئی ڈیڑھ سال شب کا کھانا میں سید صاحب اور سیّد محمود کے ساتھ کھاتا رہا۔ کھانے پر کبھی کبھی ایک آدھ اور بھی شریک ہوجاتا کھانے کی صحبت بھی بہت دل چسپ ہوتی تھی۔ کھانے کے بعد پھر سیّد صاحب کے ساتھ ان کے کمرے میں چلا جاتا اور مختلف امور اور موضوعات پر گفتگو رہتی۔۔۔۔۔۔ کبھی چائے آتی تو (سیّد محمود) ایک پیالی مجھے دیتے۔ میرے زمانے میں چائے کا رواج نہ تھا۔ میں ایک دو گھونٹ پی کر چھوڑ دیتا تو وہ میری چائے پی لیتے اور کہتے "سور المومنین شفا"۔ گالیاں بھی کبھی کبھی خوب دیتے تھے۔ ایک بار مولانا شبلی سے کہنے لگے "مولانا! آپ بہت دن سے ادھر نہیں آئے"۔ مولانا نے کہا۔ "آپ گالیاں بہت دیتے ہیں، آبرو موتی کی سی آب ہے، آب جاتی رہے تو وہ موتی کچھ بھی نہیں۔" سیّد محمود نے کہا "مولانا میں آدمی کو دیکھ کر دیتا ہوں۔" وہ بڑے ظریف اور بذلہ سنج بھی تھے۔ افسوس شراب نے کہیں کا نہ رکھا۔ رات کو جب میں ان کے پاس بیٹھا ہوتا تو کچھ کچھ دیر کے بعد وہ غسل خانے میں جاتے اور پی کر چلے آتے۔

غالباً[۲] ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء کا ذکر ہے جب میں مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ میں طالب علم

---

[۱] قومی زبان، کراچی، ۱۶ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۵ [۲] چند ہم عصر، صفحہ ۱۵۹

(ہی) تھا مولانا حالی اس زمانے میں یونین کے پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں ان تعطیلوں کے زمانے میں وطن نہیں گیا اور بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں "حیاتِ جاوید" کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی "یادگارِ غالب" کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ ایک[۱] شام کو جو میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو گفتگو کے اثناء میں مرزا غالب پر کتاب لکھنے کا تذکرہ کیا۔ میں نے کہا ضرور لکھنی چاہیے۔ غالب بہت بڑا شخص گزرا ہے یہ سن کر اپنے خاص انداز میں فرمانے لگے کہ بڑا شخص؟ ایک ہی تھا! "یادگارِ غالب" پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ بے شک وہ ایک ہی تھا۔ قیامِ کالج کے زمانے میں جب مولانا، اِس کتاب کی تالیف میں مصروف تھے تو بعض مقامات کے لیے میں نے کچھ مسالا فراہم کر کے دیا تھا، اگرچہ وہ بہت ہی حقیر تھا۔

بات[۲] میں بات نکل آتی ہے جب "حیاتِ جاوید" شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے۔ ایک میرے لیے ایک مولوی عزیز مرزا کے لیے اور تیسرا[۳] مولانا شبلی کے لیے جو اتفاق سے اس وقت حیدر آباد میں وارد تھے میں نے یہ کتاب لے جا کر ان کی خدمت میں پیش کی اس وقت وہاں اور بھی کئی اشخاص موجود تھے مولانا شبلی نے یہ کتاب دیکھتے ہی فرمایا "یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے"، مولانا نے کتاب کو پڑھے بغیر ہی یہ رائے دی..... ان کی طبیعت میں ضبط بالکل نہ تھا...... اس کے برخلاف مولانا حالی بڑے صاحبِ دل آدمی تھے۔ مجھے اپنے[۵] زمانے کے بعض نامور اصحاب سے اور اپنی قوم کے اکثر بڑے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت و خصائل کا بزرگ ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ آخر میں اُن کی دو بڑی تمنائیں تھیں ایک تو اُردو زبان میں تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنا اور ایک کوئی اور بات جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔ جب میرا تقرر اورنگ آباد ہوا تو میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا کہ یہاں کی آب و ہوا بہت معتدل اور خوشگوار ہے، پانی بہت لطیف ہے اور خصوصاً جس مقام پر میں رہتا ہوں وہ بہت ہی پُر فضا ہے آپ کچھ دنوں کے لیے یہاں تشریف لے آیئے صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور جو کام آپ

۱؎ اُردو، اورنگ آباد، اکتوبر ۱۹۳۶ء ۲؎ حالی کا ذہنی ارتقا، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کراچی ۱۹۵۶ء، صفحہ ۳۴

۳؎ چند ہم عصر، صفحہ ۱۷۷ ۴؎ رسالہ "ادیب" (شبلی نمبر)، صفحہ ۱۳ ۵؎ چند ہم عصر، صفحہ ۱۶۱

کرنا چاہتے ہیں وہ آسانی سے انجام پا جائے گا۔ کوئی مخل اوقات بھی نہ ہوگا اور یقین ہے کہ آپ یہاں آکر بہت خوش ہوں گے۔ وہ آنے کے لیے بالکل آمادہ تھے مگر اُن کے فرزند سجاد حسین صاحب اور دوسرے عزیز و اقارب رضامند نہ ہوئے۔ عذر یہ تھا کہ دور دراز کا سفر ہے، ضعیفی کا عالم ہے، طبیعت یوں بھی ناساز رہتی ہے ایسی حالت میں اتنی دور کا سفر خلافِ مصلحت ہے۔ مولانا نے یہ سب کیفیت مجھے لکھ بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جب تم اِدھر آؤ تو ایک روز کے لیے پانی پت چلے آنا، اُس وقت میں تمہارے ساتھ ہولوں گا کوئی چوں وچرا نہیں کرے گا۔ جب میں گیا تو بیمار ہو چکے تھے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ جان لے کر گئی۔[1]

۱۸۹۴ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ علی گڑھ میں ہوا۔ اسی[2] سال اور اسی کانفرنس کے اجلاس میں (سر سید راس) مسعود کی بسم اللہ ہوئی۔ اس[3] تقریب کے وقت کانفرنس کے تمام نمائندے اور کالج کے اکثر طالب علم موجود تھے .... تقریب کے خاتمے پر شیرینی تقسیم ہوئی۔ ان موتی چور لڈوؤں کا مزہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ایک روز میں سید محمود کے پاس بیٹھا تھا۔ مسعود اندر گھر سے نکل کے آئے تو میں نے کہا یہ اب بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام نہیں کرتے۔ کہنے لگے۔ میں اسے خود پڑھاؤں گا۔ ..... محمود تو کیا پڑھاتے دادا ہی ان کے لکھنے پڑھنے کی نگرانی کرتے تھے۔ ایک[4] سال میں گرمی کی تعطیلوں میں کالج ہی میں رہا۔ ایک دن سید صاحب نے مولوی حمید الدین مرحوم اور مجھ سے فرمایا کہ میرے کتب خانے کی کتابیں بہت بے ترتیب رکھی ہیں انہیں اگر کسی وقت ترتیب سے لگا دو۔ .... ایک روز دوپہر کو اسی کمرے میں ہم کتابیں ٹھیک کر رہے تھے اور سید صاحب دوسری طرف تخت پر لیٹے ہوئے تھے اور مسعود ان کی بغل میں لیٹا تھا۔ اتنے میں سید صاحب نے اپنی بھاری گنجلی آواز میں مسعود کو لوری سنانی شروع کی ہیں ان کے گانے کی آواز سن کر اس قدر ہنسی آئی کہ ضبط نہ کر سکے اور چپکے سے دوسرے دروازے سے باہر بھاگ گئے

اسکول[5] کے معلمین میں مولوی خلیل احمد صاحب کی دھج بھی نرالی تھی۔ وہ عربی کے استاد تھے چھوٹے قد کے ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ، کوتاہ نظر۔ وہ بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ ان کا کمرہ وہاں تھا،

---

۱ چند ہم عصر، صفحہ ۱۸۵ — ۲ چند ہم عصر، صفحہ ۱۸۶ — ۳ چند ہم عصر، صفحہ ۱۸۷
۴ چند ہم عصر، صفحہ ۱۸۸ — ۵ قومی زبان، کراچی ۱۶ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۶

جہاں پکی بارک ختم اور کچی شروع ہوتی ہے، دونوں کے بیچ میں تھا۔ عربی کے فاضل تھے۔ اسلامی تاریخ اور جغرافیہ پر بھی ان کی نظر تھی۔ اپنے کمرے میں بیٹھے یا لیٹے آنکھوں سے لگائے کتاب پڑھتے رہتے تھے جب کمرے کے سامنے سے کسی کے آنے جانے کی آہٹ سنتے تو کہتے "کون؟" کوئی طالب علم یا استاد ہوا تو چپ ہو جاتے اور جو کوئی بیرا یا ملازم ہوتا تو کہتے "چلم بھر لاؤ"۔ بہت سیدھے سادے شخص تھے۔ تنخواہ ملتی تو چپکے سے ایک طرف دری کے نیچے رکھ دیتے۔ بیرا کچھ نہ کچھ اس میں سے چرا لیتا۔ ایک بار انھوں نے کہیں سے آم منگائے اور کمرے میں رکھے۔ لڑکوں کو معلوم ہوا تو غیر حاضری میں چٹ کر گئے۔ واپس آئے تو دیکھا، آم غائب ہیں۔ کہنے لگے: "آم کھائے مضائقہ نہیں، گٹھلیاں تو چھوڑ جاتے۔ میں نے یہ آم باغ میں بونے کے لیے منگائے تھے۔" کبھی کبھی چھٹیوں کے بعد گھر سے آتے تو بہت سی کھیر یا رساول لاتے اور اپنے بعض طالب علموں کو بھی کھلاتے، کھانے کے بھی شوقین تھے۔ جب میں مڈل میں پڑھتا تھا تو میں نے نجی طور پر عربی پڑھی تھی۔ علی گڑھ آکر میں نے دوسری زبان فارسی لی۔ میں خوش تھا کہ میں نے فارسی لی اور اس کی بدولت مجھے شبلی جیسے صاحب ذوق استاد ملے۔ اردو بیچاری کی اس زمانے میں اسکولوں اور کالجوں میں رسائی نہ تھی — مولوی خلیل احمد مجھ سے کہا کرتے "عربی پڑھ لو یہ تمہارے کام آئے گی۔" چنانچہ انھوں نے مجھے الف لیلیٰ پڑھانی شروع کی۔ کہتے تھے "اس کی زبان بہت فصیح اور سادہ ہے اور اس میں قسم قسم کے معاملات کا ذکر آتا ہے۔" عربی سے اردو میں اور اردو سے عربی میں ترجمہ کرنا یعنی الف لیلیٰ کا جو سبق پڑھتا اس کی کچھ سطروں کا ترجمہ اردو میں کرتا اور دوسرے روز اس کا ترجمہ عربی میں کرتا۔ صرف و نحو کے قواعد وہ مجھے زبانی لکھوا دیا کرتے تھے، خوب آدمی تھے۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ اسکول سے کالج میں لے لیے گئے، وہ اسکول کی گوں کے نہ تھے۔ بعد میں شمس العلما کا خطاب بھی ملا۔ باتیں کرتے تو ان کے جملے نامکمل سے ہوتے۔ فعل اکثر ندارد ہوتا تھا، اسما و صفات اور حروف ربط سے مطلب ادا کر لیتے۔

میرے[1] زمانے میں بورڈروں کی تعداد کوئی تین سو تھی۔ ہندو طالب علم بھی تھے۔ زیادہ تر ڈے اسکالر تھے۔ شہر سے پڑھنے آتے تھے۔ میرے ہم جماعت کئی ہندو تھے۔ میرے ہم جماعت جنھوں

---

[1] قومی زبان، کراچی، ۱۶ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۷

نے بعد میں نام پایا اور مشہور ہوئے یہ تھے۔ ڈاکٹر ضیا الدین، مولوی حمید الدین، مولوی ظفر علی خاں، حافظ ولایت اللہ، سید محفوظ علی، شیخ عبداللہ، انٹرنس میں سیٹھ یعقوب حسن میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ انٹر میں کامیاب ہونے کے بعد وہ چھوڑ کر چلے گئے۔ سوا شیخ عبداللہ[1] کے باقی سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شیخ عبداللہ صاحب اس قدر ضعیف اور نحیف ہو گئے ہیں کہ کام سے معذور ہیں۔

وہ کالج جو کبھی مورد لعن وطعن تھا، مسلمانانِ ہند کی تہذیب و تعلیم اور سیاست کا مرکز بن گیا۔ یہاں سے جو آواز اُٹھتی وہ تمام مسلمانانِ ہند کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ اس کالج کا مسلمانوں پر کیا اثر ہوا ایک الگ بحث کا موضوع ہے لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مسلمانوں میں بیداری اور حیاتِ نو پیدا کرنے میں اس کالج نے جو کام کیا ہے وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

(۲)

میں[2] نے بہت ڈرتے ڈرتے (انجمن ترقی اُردو کے) بارِ گراں کو اپنے ذمے لیا کیوں کہ جس قدر یہ کام ضروری تھا، اسی قدر مشکل بھی تھا۔........ (ایک) مشکل اس کام میں کافی سرمایہ بہم پہنچانے کی تھی۔ یہ کام اس قدر وسیع اور ایسا اہم تھا کہ جب تک ہزاروں نہیں، لاکھوں کا سرمایہ نہ ہو تا اسکا خاطر خواہ چلانا ممکن نہیں تھا........ اگرچہ[3] میں اس عزت کے قابل نہیں لیکن حُسنِ اتفاق سمجھیے یا سوئے اتفاق، مجھے علی گڑھ کا طالب علم ہونے کا فخر حاصل ہے مگر میں کالج میں ایک متفا طالب علم تھا۔ (اور جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں) میں نہ کبھی کھیلوں میں شریک ہوا نہ یونین کلب میں حصہ لیا اور نہ انتخاب پریذیڈینٹ و سیکرٹری کے ہنگامے میں شامل ہوا۔ غرض جو خوبیاں ایک علی گڑھ کالج کے طالب علم کے لیے تمغائے شرافت ہیں، اُن میں سے مجھ میں ایک بھی نہ تھی لیکن نہ معلوم کیونکر کبھی چندہ حاصل کرنے کی عزت مجھے حاصل ہوئی۔ یہ سنت سرسید کی تھی مگر وہ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ طالب علم

---

[1] قومی زبان کراچی، ۱۶ ر ستمبر/اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۴۳ [2] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۲۰

[3] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، مولوی ہاشمی فرید آبادی، کراچی ۱۹۵۳ء، صفحہ ۳۰

بڑا آزاد ہوتا ہے .... وہ جس سے چاہے مل سکتا ہے اور جہاں چاہتا ہے گھس جاتا ہے نہ اُسے کسی کے چیں بہ جبیں ہونے کا ڈر، نہ کسی کے انکار سے شرم .... لیکن اتنی مدت کے بعد جب انجمن کا بوجھ سر پر آپڑا اور اس کی خاطر چار و ناچار چندے کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑا تو معلوم ہوا یہ کیسی کڑی منزل ہے۔

مجھ پر[۱] دو وقت ایسے گزرتے ہیں جب میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس کام کو میں نے اپنے سر لیا ہے اس کا اہل نہیں ہوں۔ ایک تو اس وقت جب میں کسی سے چندہ مانگنے جاتا ہوں۔ بہت کچھ سوچ کے جاتا ہوں لیکن مانگتے وقت زبان بند ہو جاتی ہے اور آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ غیرت مانع ہوتی ہے۔ دوسرے جب کسی سے معاملہ کرنے بیٹھتا ہوں۔ کاروباری آدمی کی طرح سودا کرنا کہ پسینہ آجائے مجھے نہیں آتا اور مروّت غالب آجاتی ہے۔ ان کاموں کے لیے ڈھٹائی کی ضرورت ہے۔ یہ وصفِ شریف فطری ہوتا ہے۔ سیکھنے سے نہیں آتا اور مشکل یہ ہے کہ ڈھیٹ بنو تو بناوٹ کھل جاتی ہے .... بعض[۲] اوقات مجھے ایسے حضرات کے دروازوں پر بھی حاضر ہونا پڑا جن سے کبھی ملنا بھی عار سمجھتا تھا لیکن انجمن کی خاطر سب کچھ کرنا پڑا، اس کوچے میں ہر ذلّت، عزت تھی!

آخر[۳] دسمبر ۱۹۰۳ء میں جب اوّل اوّل (انجمن) کی بنیاد رکھی گئی تو اس کا مقصد ادبی اور علمی قرار دیا گیا تھا یعنی ترجمے کا ترتیب و تالیف کے ذریعے اردو زبان کے ادبی و علمی سرمائے میں اضافہ کرنا۔ اس مقصد کی ۱۹۳۶ء تک پوری پوری پابندی کی گئی۔ (انجمن[۴]) نے کبھی ہندی یا کسی دوسری زبان کی مخالفت نہ کی۔ یہ اس کے اصول اور شعار کے خلاف تھا۔ البتہ جب اس کی مخالفت کی گئی اور اس کے رستے میں روڑے اٹکائے گئے تو اسے مجبوراً مدافعت کرنی پڑی۔ حفاظت اور سلامتی کے لیے مدافعت لازم ہے ....

۱۹۳۵ء[۵] میں مسٹر کنہیا لال منشی (غذائی وزیر) مجھ سے حیدر آباد آکر ملے اور بیان کیا کہ ہم ایک

---

۱ مکتوباتِ عبدالحق، جلیل قدوائی، کراچی ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۴۸ ۲ مکتوباتِ عبدالحق صفحہ ۲۴۸

۳ رپورٹ تیسری کل ہند انجمن کانفرنس ناگپور، صفحہ ۱۱۳ ۴ خطباتِ عبدالحق، ڈاکٹر عبادت بریلوی کراچی ۱۹۵۲ء صفحہ ۵۰۲

ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہو جائیے چونکہ یہ ادبی معاملہ تھا میں نے منظور کرلیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا سالانہ جلسہ ناگ پور میں گاندھی جی کی صدارت میں ہوا۔ اس انجمن کا نام "اکھل بھارتیہ ساہیتہ پرشد" تھا۔ اس میں ایک مسئلہ یہ پیش ہوا کہ پرشد کی زبان کیا ہونی چاہیے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا "ہندوستانی"۔ گاندھی جی نے دریافت کیا کہ میں ہندوستانی کیوں تجویز کرتا ہوں۔ میں نے کہا اس لیے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا یہ رزولیوشن ہے کہ کانگریس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ نیز کانگریس کے آئین کی دفعہ ۲۱ میں صاف طور سے یہ درج ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ اس کا یہ مطلب نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا گیا تو کام کیسے چلے گا۔ گاندھی جی ہندی کے حق میں تھے۔ جب بحث زیادہ بڑھی تو گاندھی جی نے پینترا بدلا اور ایک نئی زبان اور نیا نام تجویز کیا یعنی ہندی ہندوستانی۔ میں نے پوچھا ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرمایا وہ زبان جو کتابوں میں ہے، بول چال میں نہیں۔ پھر میں نے پوچھا ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ تو فرمایا وہ زبان جو بول چال میں ہے کتابوں میں نہیں۔ اس پر میں نے دریافت کیا تو پھر ہندی ہندوستانی زبان کیا ہوئی؟ فرمایا وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر انھوں نے جھنجھلا کر کہا میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے عرض کیا جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑ دیں۔ اس پر انھوں نے ایسا غلط اور عجیب و غریب جواب دیا جس کی ان سے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ فرمایا کہ مسلمان چاہیں تو اردو رکھ سکتے ہیں، یہ ان کی مذہبی زبان ہے، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور میں نے اکھل بھارتیہ ساہیتہ پرشد کی کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ اب ہماری آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ زمانے کا رنگ کچھ اور ہے۔ انجمن اب تک خاموشی سے علمی اور ادبی کام کر رہی تھی، اب اسے ایک نئی مہم سے سابقہ

پڑا چنانچہ اس پر غور کرنے کے لیے اسی سال علی گڑھ میں ایک کل ہند اردو کانفرنس منعقد کی گئی
جس میں علاوہ دوسرے مسائل کے ایک مسئلہ قابلِ غور یہ تھا کہ انجمن کا مستقر کہاں ہو کیونکہ اب حالات
بدلنے سے حیدر آباد میں رہ کر یہ کام حسبِ منشا انجام نہیں پاسکتا تھا۔ اسی کانفرنس میں یہ طے پایا کہ
انجمن کا صدر مقام دلّی میں منتقل کر دیا جائے۔ ملک میں اس وقت کانگریس حکومتوں کا راج تھا اس لیے
اُردو کی طرف سے تشویش پیدا ہو گئی اور انجمن کو ہر علاقے اور ہر مقام پر نظر رکھنی پڑی۔ بمبئی، یوپی،
بہار اور خاص کر سی پی کی حکومت سے بڑے معرکے کرنے پڑے۔[1]

انجمن[2] کے سیکرٹری کی حیثیت سے (سی۔ پی۔ ناگ پور) تو خیر میں بار بار گیا لیکن ہندوستان
کے دوسرے صوبوں اور علاقوں میں بھی اسی غرض سے دورے کیے۔ بنگال، بہار، یوپی، سندھ
کشمیر، گوالیار، رانچی (چھوٹا ناگ پور) جنوبی ہند میں مدراس، آندھرا، شمالی ارکاٹ، جنوبی ارکاٹ
ملیبار، ٹامل ناڈ، ٹراونکور تک گیا اور راس کماری پر جاکر دم لیا۔ لوگ مبالغے سے "کشمیر سے
راس کماری تک" کا فقرہ کہا کرتے ہیں لیکن میں نے حقیقت میں کشمیر سے راس کماری تک خاک چھانی
ہے......... مجھے راس کماری میں بھی اردو بولنے والے ملے۔ ان مقامات پر جگہ جگہ تقریریں کیں
اُردو مدرسے دیکھے، لوگوں کو اُردو کی امداد کے لیے آمادہ کیا، انجمن کی شاخیں قائم کیں، مدرسے
کھولے، معترضین کے جواب دیئے غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور غلط بیانیوں کی تردید کی۔ جہاں جہاں
اُردو پر آنچ آئی سینہ سپر ہو کر لڑا۔ کہیں کامیابی ہوئی، کہیں ناکامی۔ کامیابی سے پھول کر غافل نہ ہوا،
اور ناکامی سے آس نہ ٹوٹی میں برابر کام میں لگا رہا اور یہی میری زندگی کا مشن تھا۔ میں[3] بے وجہ مارا
مارا نہیں پھرا، مجھے دیوانے کتّے نے نہیں کاٹا۔ میں جانتا ہوں کہ اس عمر میں مجھے آسائش کی ضرورت
ہے۔ علاوہ اس کے کئی ضروری علمی و ادبی ایسے کام ہیں جنہیں بیٹھ کر پورا کرنے کی ضرورت ہے
لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ عربی[4] کی ایک مثل مشہور ہے کہ کسی چیز کی محبت انسان کو بہرہ اور اندھا

---

[1] رپورٹ تیسری کل ہند انجمن کانفرنس ناگپور، صفحہ ۱۱۴ [2] مکتوباتِ عبدالحق صفحہ ۱۸۲
[3] اُردو یونیورسٹی، وقت کا اہم تقاضا، مولوی عبدالحق، کراچی ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۳

کر دیتی ہے۔ مجھے اُردو سے محبت ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ محبت جنون کی حد تک ہے لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اُردو سے میری وابستگی کا یہ سلسلہ پوری قوم کی تہذیب، ثقافت، تصورات و نظریات اور اس کے عزائم اور حوصلوں سے ملتا ہے اور کون ایسا بدبخت ہے جسے اپنی قومی روایات اور تہذیبی اقدار سے محبت نہ ہوگی!

عثمانیہ[۱] یونیورسٹی کی تجویز اس کے منصوبے اور پھر اس کے قیام کے ہر ہر مرحلے پر مشاورتی اور عملی طور پر میں اس سے وابستہ رہا تھا۔ اس لئے جب انجمن ترقیٔ اُردو ہند کا دفتر اورنگ آباد سے دلی منتقل ہوا تو میں نے ۱۹۳۸ء میں ایک کل ہند انجمن ترقیٔ اُردو کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور پھر اس کانفرنس میں اتفاقِ رائے سے (ایک) تجویز (بھی) منظور ہوئی........کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد میں نے (اس) تجویز کے سلسلے میں متعلقہ یونیورسٹیوں کے اربابِ اختیار سے خط و کتابت شروع کی لیکن یہ زمانہ سخت سیاسی خلفشار کا تھا اور دوسری عالمگیر جنگ کی وجہ سے حالات حد درجہ غیر یقینی ہو گئے تھے۔ اس لیے اس مہم میں کامیابی کی صورت نہ پیدا ہو سکی..........یہ دیکھ کر میں نے طے کیا کہ انجمن ترقیٔ اُردو ہند کے اہتمام و انتظام میں برطانوی ہند کے کسی موزوں مقام پر ایک اُردو یونیورسٹی قائم کی جائے چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو تیسری کل ہند انجمن ترقیٔ اُردو کانفرنس ناگپور کے کھلے اجلاس میں اُردو یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں اتفاقِ رائے سے تجویز پاس ہوئی۔ یہ کوئی وقتی اور ہنگامی تجویز نہ تھی بلکہ بہت پہلے سے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور متعلقہ اصحاب کی رائے اور مشورے کے بعد مرتب ہوئی اور کانفرنس میں منظوری کے لیے پیش کی گئی........اُردو یونیورسٹی کے قیام کی اس اہم اور تاریخی تجویز کا ملک کے طول و عرض میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا........

ناگ پور کانفرنس سے دلی واپس آنے پر میں نے ایک روز قائدِ اعظم محمد علی جناح کو اپنے ساتھ ڈنر کا کھانا کھانے کی زحمت دی۔ قائدِ اعظم نے بکمال مہربانی میری دعوت قبول فرمائی۔ کھانے پر جہاں قومی تعمیر کے مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی، مجوزہ اُردو یونیورسٹی کا بھی ذکر آیا۔ اور قائدِ اعظم نے اس منصوبے سے بڑی

---

[۱] اُردو یونیورسٹی، وقت کا اہم تقاضا، صفحہ ۱۶،۱۹۔

دل چسپی اور ہمدردی کا اظہار فرمایا۔

روز[1] بروز کام اس قدر بڑھتا جاتا تھا کہ بعض وقت گھبرا جاتا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیوں کر سمیٹوں۔ میں[2] تو کمبل کو چھوڑتا ہوں، کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ انجمن[3] کے کام اور اس کی مشکلات اس قدر بڑھتی جاتی تھیں کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے یا نو سے جو بیٹھتا تو کام کرتے کرتے شام ہو جاتی۔ بیچ میں چائے پینے اور اخبار پڑھنے کے لئے ایک گھنٹہ (ضرور) مل جاتا پھر بھی کام پورا نہیں ہوتا تھا— اس کا مضائقہ نہیں، کام ہو ہی جاتا تھا لیکن بعض مشکلات ایسی آپڑی تھیں کہ ان کا حل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

رائے[4] دینے میں بڑا لُطف ہوتا ہے جب کوئی ہم سے رائے طلب کرتا ہے تو ہم فوراً اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھنے لگتے ہیں کم سے کم اپنے تئیں افضل خیال کرتے ہیں۔ رائے پوچھنے کے ساتھ ہی ہماری متانت قابلِ دید ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے جس شخص سے لوگ زیادہ تر رائے پوچھتے ہیں وہ آخر میں بہت خود پسند اور مغرور ہو جاتا ہے۔ خیال (کرنے کی بات ہے) جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دس کروڑ اُردو بولنے والوں کی ہدایت کے لیے رائے دے رہے ہیں تو ہمارے دماغ کی کیا حالت ہو گی—! جب کوئی لفظ پیش ہوتا ہے اور ہم غور و فکر کی صورت بنا کر یا کبھی سر پیچھے ڈال کر اور آنکھیں بند کر کے سوچتے ہیں تو وہ عالم ملاحظے کے قابل ہوتا ہے کہ حضرت کا دماغ تو عرش پر ہے اور دنیا و مافیہا ہیچ ہے! (ہاں) جب[5] میں الفاظ کی تحقیق کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کیا کچھ حیرت انگیز معلومات ان سے آشکار ہوتے ہیں۔ میں نوجوانوں کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ لکھتے رہیں۔ اس میں بڑی کرامت ہے، یہ عجیب چیز ہے، لکھتے وقت انسان کے تمام قوائے ذہنی مجتمع ہو جاتے ہیں۔ آنکھ دل اور دماغ سب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک محویت طاری ہو جاتی ہے۔ آپ پہلے سے ہر صفحے کو سوچ لیجیے اور جب آپ لکھنے بیٹھتے ہیں تو نیا خیال پیدا ہوتا ہے، یہی کرامت ہے۔ اس سے اخلاق درست

---

[1] مکتوباتِ عبدالحق صفحہ ۲۶۴ [2] مکتوباتِ عبدالحق صفحہ ۲۶۸ [3] مکتوباتِ عبدالحق صفحہ ۲۷۸ [4] مکتوباتِ عبدالحق صفحہ ۴۷۹

[5] رسالہ "نورس"، کراچی، صفحہ ۳۶

ہوتے ہیں، صوفیائے کرام کے ہاں جسے "توجہ" کہتے ہیں وہ اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے انسان فرشتہ ہو جاتا ہے، اس عمل سے انسان کا دماغ وسیع ہو جاتا ہے۔ بکو اس عقل میں کثافت پیدا کرتی ہے۔ بکو اس کم کرنی چاہیئے اور کام زیادہ!

(۳)

ہم[1] نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو!

انجمن[2] کے مکان (نمبر ایک، دریا گنج) میں یوں تو پہلے ہی سے مہربانوں اور مہمانوں کی آمد رہتی تھی لیکن جب دلی کی آبادی اور رونق اور اس کی اہمیت بڑھنے لگی تو ہمارے مہمانوں کی چہل پہل بھی پہلے سے بڑھ گئی۔ ہمارے کمرے بھرے پرے نظر آتے تھے۔ ان میں لیگی بھی تھے کانگریسی بھی، خلافتی بھی تھے اور کمیونسٹ، کونسلوں کے ممبر بھی تھے اور لیڈر بھی، اہلِ علم بھی تھے اور طالب علم بھی، گاندھی جی کے معتقد اور چیلے بھی تھے اور ان کے مخالف بھی، ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں سیاست سے یا دوسرے کاروبار سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اگرچہ یہ مختلف خیالات اور مختلف اصول کے لوگ تھے مگر اُردو کے بہی خواہ اور انجمن کے ہمدرد تھے .... اس لئے وہ مجھے سب عزیز تھے۔ ان میں اور مجھ میں صرف ایک رشتہ تھا اور وہ رشتہ اردو زبان کا تھا۔ ایک بڑی خوبی اس محبت میں یہ تھی کہ نہ میں ان کے معاملات میں دخل دیتا تھا نہ وہ میرے کام میں ہارج ہوتے تھے۔ میں بڑے اطمینان سے اپنا کام کرتا رہتا تھا اس لیے ان صاحبوں کا آنا مجھے کبھی ناگوار نہ ہوتا بلکہ .... ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ کام سے فارغ ہونے کے بعد ان سے باتیں کرنے اور گپ شپ کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ دن بھر کی تھکن اور کوفت دور ہو جاتی تھی اور دوسرے دن کے کام کے لیے ہشاش بشاش تیار ہو جاتا تھا۔ کام کرنے

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۶۷
[2] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۷۲-۱۶۹

والے کے لیے ایسی تفریح ٹانک کا کام دیتی ہے، پھر ایسی صحبت ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہے یہ خدا کی دین ہے ...... اب اُن دونوں کی یاد میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے....

جولائی ۱۹۴۷ء کی ۱۴ تاریخ اور پیر کا دن۔ حسبِ معمول اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ دن میں کھانا کھاتا نہیں اس لئے بے تکان کام کرتا ہوں۔ تیسرے پہر یکایک میرے ایک عزیز مہمان جو کئی روز سے ٹھہرے ہوئے تھے، میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے تیار ہو جائیے، آپ کو میرے ساتھ (حیدر آباد) چلنا ہوگا........ میں آپ کا ٹکٹ خرید چکا ہوں کل صبح ہوائی جہاز جاتا ہے...... میں تیار ہو گیا اور اپنے آدمی سے کہا کہ وہ ریل سے میرا سامان لے کر حیدر آباد آجائے۔ یہ ۱۵ر جولائی منگل کا دن تھا۔ اسی روز ہم دوپہر کے بعد حیدر آباد پہنچ گئے وہاں مجھے...... بعض معاملات طے کرنے تھے........ ان تمام کاموں سے آخر اگست تک بہت کچھ فراغت ہو گئی۔ اب دلی کا قصد کیا، ۳ر ستمبر کی شام کو گرانڈ ٹرنک سے بھوپال روانہ ہوا۔ وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز دلی جانے کا ارادہ تھا۔ اس سفر میں سیّد علی شبر حاتمی میرے ہمراہ تھے۔ ۵ر ستمبر کو بھوپال پہنچے اسٹیشن پر میرے کرم فرما مہربان شعیب قریشی صاحب ملے....... انہوں نے کہا دلی کے حالات آج کل خراب ہو رہے ہیں ایسے وقت میں جانا خلافِ مصلحت ہے..... اس باب میں شعیب صاحب نے بڑی شدت سے اصرار کیا۔ میں ٹھہرنے پر رضامند نہ تھا۔ اب وہ اصرار سے تشدد پر اتر آئے اور فرمانے لگے کہ آپ اس طرح نہ مانیں گے تو میں نواب صاحب سے کہہ کر آپ کے نام وارنٹ جاری کرا کر گرفتار کرا دوں گا۔ آخر یہ طے پایا کہ چند روز بھوپال میں قیام کر کے انتظار کروں اگر وہاں کے حالات قابلِ اطمینان پائے جائیں تو شوق سے چلا جاؤں ورنہ اس خیال کو ترک کر دوں۔ تین چار روز ہی کے بعد جو خبریں آئیں وہ بہت ہی پریشان کن تھیں جس ریل سے میں بھوپال آیا اسی میں حیدر آباد کے چند نوجوان طالب علم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جا رہے تھے ان میں سے جو دلی کے رستے گئے وہ رستے ہی میں قتل کر دیے گئے۔ شعیب صاحب کا فرمانا صحیح نکلا۔

بھوپال میں پڑے پڑے بارہ روز ہو گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۸ ستمبر کو انجمن کے کارکنوں کے خط پہنچے کہ بلوائیوں نے انجمن کے مکان پر حملہ کیا تمام سامان اور مال و اسباب لوٹ لیا اور غارت کر دیا۔ مکان کھلا پڑا ہے اور اللہ کی امان میں ہے ۔ یہ خط پڑھ کر مجھے بے حد پریشانی ہوئی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے ۔ سب سے زیادہ الم ناک سانحہ یہ تھا کہ جب لیٹروں نے انجمن پر حملہ کیا تو جو ملازم اس وقت مکان میں رہ گئے تھے[1] وہ اِدھر اُدھر بھاگ کر جان سلامت لے گئے لیکن ہمارا ایک بڈھا کاتب اپنی جگہ سے نہ ہلا ، ہر چند دوسرے ملازموں نے اسے ساتھ لے چلنے کے لیے کہا مگر وہ نہ مانا اس کی بیوی علیل تھی اس لئے وہ وہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا ۔ ظالموں نے اُسے اور اُس کے بیوی بچوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر ڈالا ۔ یہ بہت قابل اور فرض شناس کاتب تھا اور اپنا کام خاموشی سے بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ کرتا رہتا تھا ۔ اس واقعے سے میرے دل کو سخت رنج پہنچا اور تکلیف ہوئی ۔ گاندھی جی اس زمانے میں دلّی آ گئے تھے اور قتل و غارت اور خونریزی اور باہمی منافرت کے جو شعلے بھڑک رہے تھے اُن پر پانی چھڑکنے کی کوشش کر رہے تھے ۔

اس وقت مجھے سب سے بڑی فکر ان کتابوں کی تھی جو میرے کمرے میں تھیں اور کتاب خانے کی جان تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں چاہتا تھا کہ خود جاؤں اور دیکھوں کہ کیا گیا اور کیا رہا ، کیا کھویا اور کیا بچا لیکن شعیب صاحب اور دوسرے اصحاب سب مانع آئے کہ یہ وقت دلّی جانے کا نہیں دہلی سے (کچھ) خط بھی اسی مضمون کے آئے کہ وہاں جانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے ناچار دل مسوس کے رہ گیا ۔

بھوپال میں خالی پڑے رہنا مناسب خیال نہ کیا ۔ اِتنے دن بھی جو وہاں لگ گئے تو وجہ یہ تھی کہ ملیریا نے آدبوچا تھا ۔ اچھا ہوتے ہی ۲۵ ستمبر کو حیدر آباد چل دیا ۔ وہاں جو کام باقی رہ گیا تھا اُسے سمیٹنا تھا ۔ وہاں پہنچ کر کام شروع کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دلّی اُن دنوں مصائب و

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ، صفحہ ۱۷۵

آلام کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ قتل و غارت اور خونریزی کا بازار گرم تھا جس کے سامنے نادر شاہ کا قتلِ عام اور غدر کے مظالم ہیچ تھے۔ ......گاندھی جی کے عبادتی جلسوں میں نہ عبادت کا تقدس باقی رہا تھا اور نہ روحانیت کی روشنی۔ اب وہ جلسے کانگریس کا ادنیٰ درجے کا سیاسی پروپگنڈہ ہو کے رہ گئے تھے۔ جوناگڑھ کے حملے کو انھوں نے جائز قرار دیا اور کشمیر (پر حملے کے لیے) فوجوں کو اپنی دعاؤں کے ساتھ روانہ کیا۔ وہ اہنسا جس کا غلغلہ سارے عالم میں مچا ہوا تھا اور جس کی بنا پر گاندھی مہاتما مثل مسیح اور بدھ سمجھے جاتے تھے اس کا خاتمہ جمنا کے کنارے پر ہوا معلوم ہوا کہ یہ اصول نہ تھا بلکہ وقت کی مصلحت تھی جس کی حیثیت ایک سیاسی چال سے زیادہ نہ تھی۔ ۵ راکتوبر کو میں نے گاندھی جی کی خدمت میں اسی بارے میں ایک طویل خط لکھا اور اس کا انھوں نے جواب دیا۔ اس کا ذکر یہاں مناسب نہ ہوگا کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

میں حیدرآباد میں پڑے پڑے گھبرا گیا تھا اور دلّی جانے کے لیے بے چین تھا۔ آخر ۲۴ راکتوبر کو بھوپال روانہ ہوگیا۔ ......۸ رنومبر کو سیّد علی شبر حیدرآباد سے دہلی روانہ ہو گئے اور ۹ رنومبر کو میں، ہم مولانا (ابوالکلام آزاد) کے مہمان رہے۔ دوسرے دن یعنی ۱۰ رنومبر کو نمبرا دریا گنج، یعنی انجمن کا مکان دیکھنے گیا تو مکان کا نقشہ ہی کچھ دوسرا نظر آیا کہ بھارت انشورنس کمپنی لاہور نے قبضہ کر رکھا ہے .... میرا جی دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ میری ان کتابوں کا کیا حشر ہوا جو میرے کمرے میں تھیں۔ جس کمرے میں مَیں کام کرتا تھا وہ بہت بڑا اور وسیع تھا۔ کوٹھی بھر میں اس سے بڑا کوئی ہال نہ تھا۔ اس میں کتابوں کی متعدد الماریاں تھیں۔ کھلی الماریوں کے سوا دو بڑی فولادی الماریاں جن میں خاص خاص نادر قلمی نسخے اور قدیم فرامین اور کاغذات اور بعض نامور اشخاص مثلاً: ناسخ، غالب، سرسید، حالی، محسن الملک، اقبال، سرتیج بہادر سپرو وغیرہ کے خطوط اور اسی قسم کی بہت سی عزیز اور بیش قیمت اشیا رکھی تھیں۔ ان کے علاوہ کئی بڑے صندوق تھے جن میں میرے نوٹ اور مختلف قسم کی اور خاص کر اردو لغات کے متعلق

لہ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۸۲-۱۷۷

بہت سامان، الفاظ کی اصل کا تحقیقی سرمایہ، اردو زبان کی تاریخ کی یادداشتیں اور مضمون، اور اردو ہندی تنازعہ کے متعلق بہت سے قدیم کاغذات (میرا ارادہ اس تنازعے کی تاریخ لکھنے کا تھا) اور بہت بڑا حصہ اردو لغات کے صاف کیے ہوئے مسودوں کا تھا۔ اس سے ملا ہوا ایک کمرہ تھا جس میں میرے کپڑوں کی الماری اور صندوق تھے۔ کپڑے اور دوسری چیزیں جو اس کمرے میں تھیں وہ تو لٹیروں نے سب لوٹ لیں، جو صندوق بڑے، نئے اور اچھے تھے وہ بھی لے گئے باقی وہیں چھوڑ گئے۔ بڑے کمرے میں کاغذات کے جو صندوق تھے وہ انہیں بہت پسند آئے، کاغذات تو انھوں نے وہیں پھینک دیئے اور صندوق لے کر چلتے بنے۔ فولادی مقفل الماریوں پر ان کی للچائی ہوئی نظریں پڑیں اور سمجھے کہ ان میں ضرور مال و زر ہوگا، پتھر مار مار کر انہیں توڑا جب ان میں کتابوں اور کاغذوں کے سوا کچھ نہ ملا تو بڑی مایوسی ہوئی اور غصے کی جھانجھ میں وہ سب کتابیں اور کاغذ نکال نکال کر باہر پھینک دیئے۔ کتاب خانے کے کمروں میں زیادہ گنجائش نہ رہی تھی اس لیے دو فولادی مقفل الماریاں کھانے کے کمرے میں رکھوا دی تھیں۔ ان میں اردو لغات کے پرچوں (کارڈوں) کے بنڈل بھرے ہوئے تھے، انہیں پرچوں پر سے کاتب نقل کر کے لغات کا مسودہ تیار کرتا تھا جو نظرِ ثانی اور ترمیم و اصلاح کے بعد مبیضے کے لیے کاتب کو دے دیا جاتا تھا۔ میرے کھانے پینے کا سامان اور ظروف وغیرہ تو لوٹ ہی لے گئے تھے لیکن مقفل الماریوں کو دیکھ کر قیاس کیا کہ ان میں ضرور قیمتی اشیا ہوں گی انہیں توڑا تو یہاں بھی وہی ناکارہ کاغذ نکلے جو انہیں دوسرے کمروں میں ملے تھے۔ ان میں کچھ قلمی بیاضیں بھی تھیں۔ ان کا بھی وہی حشر ہوا۔ اٹھا اٹھا کر فرش پر اس طرح بکھیرے پڑے تھے جیسے پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے۔!!

بھارت کمپنی کو کمروں کی ضرورت تھی اور مالک کو کرایہ کا لالچ۔ لہٰذا کمرے خالی کرنے کے لیے انھوں نے یہ سب چیزیں جو میرے کتاب خانے کی جان تھیں بے دردی سے صحن میں کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیں جہاں وہ کئی روز تک پڑی رہیں، بہت سے کاغذ ہوا میں اڑ گئے اور کچھ آنے جانے والوں کی روندن میں آ گئے اور جو کتاب یا کوئی چیز پسند آئی مالِ غنیمت سمجھ

کرلے لی۔ ان میں بعض نہایت خوش خط قدیم قرآن شریف تھے۔ وہ پھاڑ ڈالے۔ قدیم اردو کتابیں خطِ نسخ میں لکھی ہوتی ہیں انہیں بھی وہ قرآن سمجھے اور پھاڑ ڈالے۔ نیچے کمرے رسالوں اور اخباروں سے بھرے پڑے تھے۔ مالک مکان نے اپنی مہربانی سے وہ سب اخبار اور رسالے اور بہت سی ردّی اور صحن میں باقی ماندہ پڑی ہوئی کتابیں اور کاغذات ڈھو کر باورچی خانے غسل خانوں، گدام برآمدوں اور کتاب خانے کے بغلی کمرے میں پھنکوا دیے۔ ردّی کے یہ بڑے بڑے انبار جگہ جگہ پڑے تھے کتاب خانے کو کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی لیٹروں کے قدم آئے تھے۔ الماریوں کی کتابیں درہم برہم کردی تھیں اور کچھ نیچے پڑی تھیں اور جو الماریاں مقفل تھیں ان کے تالے بھی توڑ کر معائنہ کیا اور کتابیں الٹ پلٹ کردیں اور جو پسند آئیں وہ نکال کرلے گئے۔ اب ہم نے ردّیوں کے ڈھیروں کا ایک ایک کاغذ دیکھنا شروع کیا۔ کسی کتاب کا کوئی کاغذ ایک جگہ اور کوئی دوسری جگہ ملا۔ اس تلاش اور چھٹائی میں کئی مہینے لگ گئے۔ اس کام میں چودھری رحم علی الہاشمی، رفیق الدین احمد محمد یعقوب، میں اور بعد میں حامد علی صاحب برابر مصروف رہے۔ بعض نسخوں کے کاغذات جو مختلف ردیوں میں ملے جوڑ جوڑ کر الگ کیے جو پھر بھی ناقص رہے۔ بعض کے حصّے پھٹے ہوئے ملے، صرف چند درست حالت میں تھے مگر اکثر تلف ہوگئے۔ یہ کام ہمارے لیے بہت اجیرن ہوگیا تھا شام کو جب ہم اس سے فارغ ہوتے تو ہماری صورتیں دیکھنے کے قابل ہوئی تھیں بعض تو بالکل بھوت نظر آتے تھے۔ .... غرض ہماری، کتابوں اور کاغذوں کی یہ درگت بنی اس سے جو رنج اور کوفت ہوئی اسے کیوں کر بیان کیا جائے۔ الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ ایسے مقام پر ان چیزوں کا کیا رنج کیا جائے جہاں ہزاروں لاکھوں عزیز جانیں ایسے ظلم و جبر کا شکار ہوگئی ہوں جو دیدہیں نہ شنید، جہاں بے حرمتی اور بے عزتی کی انتہا ہوگئی ہو، جہاں معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کے ٹکڑے ٹکرے کردیئے گئے ہوں، جہاں خون پانی کی طرح بہایا گیا ہو۔

میں اور علی شبّر تو مولانا کے ہاں پہلے ہی سے مہمان تھے۔ دو روز کے بعد رفیق الدین احمد بھی آگئے۔ اب ہم تین ہوگئے۔ میں نے وہاں زیادہ قیام مناسب نہ سمجھا۔ ایک ہفتے کے بعد ہم

نظام پیلس کے گیسٹ ہاؤس (مہمان خانہ) میں اُٹھ گئے۔ وہاں گئے ہمیں چار روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا حیدر آبادی وفد آرہا ہے اور ان کے ساتھ بڑی جماعت ہوگی۔ ہمارے لیے کوئی جگہ نہ رہے گی۔ ہم نے ہر چند کوشش کی کہ کوئی مکان مل جائے یا کوئی اور صورت ٹھہرنے کی نکل آئے مگر کامیابی نہ ہوئی لہٰذا مجبوراً کراچی روانہ ہو گئے۔ جہاں ہم نے اپنے قدیم کرم فرما اور شفیق آنریبل پیر الٰہی بخش کے ہاں قیام کیا.........دلّی کے اس پندرہ روزہ قیام میں ہم شہر کو زیادہ نہ دیکھ سکے۔ ہماری قسمت میں تو ردی کی چھانٹن لکھی تھی۔[1]

انجمن[2] کی شاخیں سارے ملک میں تھیں تقسیم کے بعد پاکستان کی شاخوں کا الحاق ہندوستان سے قائم نہیں رہ سکتا تھا اس لیے ضروری ہوا کہ پاکستان کے لیے نیا مرکز قائم کیا جائے۔ اس معاملے میں بڑی بحث رہی کہ یہ مرکز لاہور میں ہو یا کراچی میں۔ آخر یہ طے پایا کہ کراچی ہی میں رکھا جائے۔ جو مرکزی حکومت کا بھی دارالحکومت ہے اس سے امداد ملنے کی بھی توقع ہے، اور سندھ کی حکومت بھی ضرور کچھ نہ کچھ مدد دے گی۔ لاہور میں تو کام کرنے والے بہت ہیں زیادہ ضرورت سندھ، بلوچستان اور سرحد میں کام کرنے کی ہے۔ اب ہمیں ایسے مکان کی تلاش ہوئی جو انجمن کی ضروریات کے لیے مناسب ہو.........اس کام میں ہمیں سب سے بڑی مدد اپنے ہمدرد اور مخلص دوست پیر سید حسام الدین راشدی صاحب سے ملی۔[3]......بشارداس مندر گجراتیوں کا سب سے بڑا ادارہ تھا اور اس میں تخمیناً بارہ سو طالب علم تعلیم پاتے تھے۔ انجمن کے لیے اس سے بہتر عمارت کراچی شہر میں نہیں مل سکتی تھی.........میں دلّی جانے کے لیے تڑپ رہا تھا میرے سب دوست احباب سمجھاتے تھے کہ اب اس ملک میں اردو کے کام کے لیے کوئی گنجائش نہیں.........میں[4] ان سے بحث نہیں کرتا تھا۔ میرا ایک ہی جواب تھا کہ ہندوستان میں ہمارے لاکھوں، کروڑوں بھائی اس زبان کے بولنے والے ہیں ان کی خدمت

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۸۳

[2] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۸۵

[3] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۸۶

کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے۔

آخر میں نے......... پھر ایک بار دلّی جانے کا قصد کیا......... ۱۳ر جنوری کو علی شبّر[1] نے مجھے اور حامد علی صاحب کو زاہد حسین صاحب کے ہمراہ ہوائی جہاز میں سوار کر دیا۔ میں زاہد حسین کے ہاں مہمان رہا...... انجمن کے مکان میں گیا وہاں ردّیوں کی چھٹائی کا کام جاری تھا جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ ان ردّیوں کی چھٹائی اور کتب خانے کے معائنے کے بعد بہت سی کتابوں اور مسوّدوں کے تلف ہونے کا ٹھیک ٹھیک علم ہوا۔ جب کوئی عزیز کتاب یا مسودہ نہیں ملتا تھا تو اس کے ضائع ہونے پر دل کو چوٹ سی لگتی تھی۔

دلّی پہنچنے کے بعد میں دوسرے روز گاندھی جی سے ملنا چاہتا تھا لیکن اسی روز انھوں نے فاقہ شروع کر دیا پانچ روز بعد انھوں نے فاقہ توڑ دیا لیکن فوراً ملنا مناسب خیال نہ کیا کیوں کہ اُن پر نقاہت کا اثر تھا......... میں رفیق صاحب کے ساتھ علی گڑھ چلا گیا اور سفر سے واپسی پر ملاقات کو منحصر رکھا.........

۲۵ر جنوری ۱۹۴۸ء کو ۶ بجے شام کو میری درخواست پر اولڈ بوائز لاج میں ہمدردانِ اُردو کا اجتماع ہوا۔ اس میں قریباً پچیس حضرات تشریف لائے......... اس کا مقصد اِن دو اُمور پر غور کرنا تھا اوّل یہ کہ انجمن ترقّیِ اُردو کا صدر مقام اب کہاں رکھا جائے دوسرے موجودہ حالات میں اس کا پروگرام کیا ہو......... اس اجتماع[2] میں جو صاحب شریک تھے ان کی گفتگو سے مجھ پر یہ اثر ہوا کہ یہ لوگ موجودہ حالات کی وجہ سے کچھ سہمے ہوئے ہیں اور کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے یا صاف صاف کچھ کہنا نہیں چاہتے۔

۲۸ر جنوری کو میں الہ آباد روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کے ہاں قیام تھا......... ۳۰ر[3] جنوری کو مغرب کے وقت اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میاں زُبیر دفرزند ڈاکٹر

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۹۰

[2] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۹۲

[3] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۹۳

عبدالستار صدیقی) گھبرائے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ کسی نے گاندھی جی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا .... میں دوسرے دن دلّی جانے والا تھا اور ارادہ تھا کہ یکم فروری کو گاندھی جی سے ملاقات کروں گا۔ افسوس دل کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی .... دوسرے روز دلّی واپس آگیا۔

دلّی کے اس دورانِ قیام میں مکان کی تلاش میں حامد علی صاحب اور میں دلّی کے کوچوں کی خاک چھانتے پھرے کوئی مکان ایسا نظر نہ آیا جہاں ہم اپنا دفتر اور کتب خانہ منتقل کرسکیں .... مجھے[۵] کراچی .... واپس جانا پڑا کہ زاہد حسین صاحب کا دلّی سے تبادلہ ہو گیا اور میرے قیام کی کوئی صورت نہ رہی ....

یہاں[۶] آتے ہی ہم اپنے کام میں مصروف ہوگئے اور انجمن ترقیٔ اردو پاکستان کا ڈول ڈالنا شروع کردیا۔ ایک کام اس اثنا میں یہ کیا کہ قائدِ اعظم مسٹر محمد علی جناح کو لکھا کہ .... ہماری تمنا یہ ہے کہ انجمن کا افتتاح اپنے دستِ مبارک سے فرمائیں۔ قائدِ اعظم مسٹر محمد علی جناح نے اپنے جواب میں بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ (۱۶/ مارچ ۴۸ء) اور لکھا کہ آج کل بہت مصروف ہوں سرحد کے دورے سے واپسی پر ۱۵/ اپریل کے بعد کسی روز بڑی خوشی سے انجمن ترقیٔ اردو پاکستان کا افتتاح کروں گا۔

کراچی[۷] میں انجمن کا کام آہستہ آہستہ جم رہا تھا مگر میرے دل میں دلّی کی لو لگی ہوئی تھی اور سوتے جاگتے وہیں کے خواب دیکھتا تھا۔ خاص کر اپنے کتب خانے کی بربادی کا خیال بہت ستاتا تھا .... بدقسمتی[۸] سے اسی زمانے میں میری طبیعت سخت ناساز ہوگئی .... سب کی یہ رائے قرار پائی کہ تبدیل آب و ہوا کے لیے کوئٹہ چلا جاؤں جہاں کی آب و ہوا صحت کے لیے بے نظیر ہے۔ چنانچہ میں ۲۲/ جولائی کو کوئٹہ روانہ ہوگیا .... (وہاں) میرے لیے ایک

---

۵ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۹۵
۶ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۹۶
۷ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۹۸
۸ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۹۹

نہایت عظیم الشان چنار کے درخت کے متصل کہ جس کی بلندی اور پھیلاؤ کو دیکھ کر قدرت کا تماشا نظر آتا ہے، ایک بڑا ڈیرا لگا دیا (گیا) تھا۔ میں دن بھر اس درخت کے سائے میں بیٹھا کام کرتا رہتا اور اس شان دار درخت کی شوکت و عظمت اور گھنے سائے کا لطف اُٹھاتا رہتا......

ابھی[1] مجھے کوئٹہ آئے سولہ سترہ دن ہوئے تھے کہ کراچی سے یہ وحشت ناک خبریں پہنچیں کہ اگر میں جلدی دلّی نہ پہنچا تو حکومت انجمن کو امداد بھی نہ دے گی (جس کی منظوری ہو چکی ہے) زمین بھی ضبط کر لے گی اور کتب خانے سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ خبر بعض نہایت معتبر اشخاص دلّی سے لائے تھے............. اس سے مجھے بے حد پریشانی ہوئی........ دوسرے روز یعنی ۱۰ اگست کو کراچی روانہ ہو گیا...... ہمارے احباب نے جو اس وقت کے حالات سے زیادہ باخبر تھے یہ مشورہ دیا کہ پہلے جناب کیفی صاحب کو دلّی بھیجا جائے........ وہ دلی پہنچ کر وہاں کا رنگ دیکھیں اور تمام حالات معلوم کر کے لکھیں اس کے بعد مجھے دلی کا قصد کرنا چاہیے[2]

۱۱ ستمبر[3] کی شب کو قائدِ اعظم رحلت کر گئے۔ اِنا للہ و اِنا علیہ راجعون۔ پاکستان پر اندھیرا چھا گیا۔ لوگ اس خبر کو سن کر مبہوت رہ گئے۔ (اُن کے ہاتھوں انجمن کے افتتاح کی حسرت ہی رہ گئی) دوسرے دن یہ خبر پہنچی کہ بھارت کی فوج حیدرآباد پر چڑھ آئی ہے۔ ۱۸ کو معلوم ہوا کہ ہندی فوجیں حیدرآباد میں داخل ہو گئیں اور سیاہی کا وہ داغ جو کبھی بنگال اور دکن کے چہروں پر نمایاں ہوا تھا اس تاریخ کو حیدرآباد کی پیشانی پر چمکا۔

میں[4] ۳ اکتوبر کو ہوائی جہاز سے دلّی روانہ ہوا...... دلّی پہنچنے کے دو دن بعد یعنی ۵ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا اور حقیقتِ حال بیان کی کہ انجمن کے لیے کوئی مکان نہیں ملتا۔ انجمن کے نام سے لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ بہت بدگمانیاں ہیں آپ لاہور یا کراچی کو اپنا صدر مقام بنائیے۔ یہ ٹھیک نہیں کہ آپ

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۲۰۰
[2] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۲۰۰
[3] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۲۰۲
[4] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۲۲۳

کی ایک ٹانگ یہاں رہے اور ایک وہاں۔

میں نے کہا میں، دونوں جگہ کام کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس سے بھی آگے افغانستان، ایران چین، عرب، انڈونیشیا وغیرہ میں، رہی بدگمانیاں تو ان کے رفع کرنے کی یہی صورت ہے کہ زبان اور کلچر جو پاکستان اور بھارت کی اکثر آبادی میں مشترک ہے اس کے لیے پوری آزادی ہو خصوصاً اُردو کے لیے جو یہاں کروڑوں انسانوں کی زبان ہے۔ کہا یہ ٹھیک ہے لیکن موجودہ حالات ایسے نہیں کہ آپ یہاں کام کریں۔ میں نے کہا آپ تعزیرات ہند میں ایک دفعہ کا اضافہ کیوں نہیں کر دیتے کہ ہمیشہ کے لیے جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ جناب کیفی صاحب سے ملا وہ اس سے قبل ڈاکٹر تاراچند سے ملے تھے۔ انہوں نے بھی ایسی ہی باتیں کیں جس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت ہم سے بدگمان ہے۔

اب ہمارا کام فی الحال یہ رہ گیا تھا کہ صبح ناشتے کے بعد کتب خانے جاتے، کتابوں کی ترتیب درست کرتے اور جو خراب اور شکستہ ہو گئی تھیں یا بارش کی وجہ سے جن کی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی ان کو الگ رکھتے جاتے۔ شام کو قیام گاہ پر واپس آتے۔

میں[1] نے کلکتہ عبدالرحمٰن صدیقی کو خط لکھا اور انجمن پر جو گزر رہی تھی اُس کی اطلاع دی اور لکھا کہ آپ یہاں آکر ہماری مدد کیجیے۔ چنانچہ وہ ۱۶ دسمبر کو دہلی پہنچ گئے اور .... دوسرے ہی روز سے اپنی مہم شروع کر دی) .... مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا آخر بیزار ہو کر ۲۸ دسمبر کو ہوائی جہاز سے بھوپال چلے گئے۔

یہ لکھنا[2] بھول گیا کہ جب تک دلّی میں رہے سی، آئی، ڈی کی ہم پر نگرانی رہی۔ بعض اوقات میرے ملازموں کو ستاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ آج کل کیا کر رہے ہو اور کون کون ملنے آتا ہے .... دلّی میں رہ کر ہم نے سب جتن کر کے دیکھ لیا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی آخر تنگ آکر اسی میں خیریت دیکھی کہ دلّی کو خیرباد کہہ دیں۔ چنانچہ ۶ جنوری ۴۹ء کو میں گرانڈ

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۲۲۶

[2] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۲۲۷

ٹونک سے بھوپال روانہ ہو گیا۔ بھوپال پہنچ کر چند روز آرام کیا اور دلّی کی کثافت اور کوفت سے نجات پائی .... ۲۴؍جنوری کو بھوپال سے روانہ ہو کر ۲۵؍ کی صبح کو بمبئی پہنچا۔ دو تین روز قیام کر کے بعض احباب سے ملا اور دو ایک کام بھتے وہ کئے۔ آخر ۲۸؍جنوری ۱۹۴۹ء کو بمبئی سے یہ شعر پڑھتا ہوا طیارہ میں سوار ہوا:

رُخصت اے ہندوستان اے بوستانِ بے خزاں

رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں!

یہ جو کہتے ہیں "شاعری جزویست از پیغمبری"، کبھی کبھی یہ بات سچ ثابت ہوتی ہے۔ حالی نے یہ شعر ۷۵ سال پہلے لکھا تھا اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ کبھی ایسا وقت آئے گا!

جہاز ساڑھے بارہ بجے کراچی پہنچا — ہوا خانے پر شعیب قریشی صاحب، سید ہاشمی صاحب .... عبداللطیف خاں صاحب اور پیر حسام الدین صاحب ملے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ خیر و عافیت سے پاکستان پہنچ گیا۔ اب یہاں نئی مہم کا آغاز ہو گا۔[1]

(۴)

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو[2]

ورق جب اس کا اُڑا لے گئی ہوا ایک ایک

مصیبت[3] بعض اوقات رحمت ثابت ہوتی ہے .... یہ تازیانے کا کام دیتی ہے جس سے سوئی سوئی قوتیں جاگ اُٹھتی ہیں اور اڑی ہوئی سوتیں کھل جاتی ہیں ...... جو کام پہلے ان ہونے معلوم ہوتے تھے وہ آسان نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ وقت ہم پر بھی ایسا ہی آیا تھا۔ یہ درحقیقت ہمارے امتحان کا وقت تھا۔ میں[4] تو سدا کا پردیسی ہوں۔ نہ کبھی گھر بنایا اور

---

[1] خطباتِ عبدالحق صفحہ ۲۶۱ — [3] خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۲۸۵

[2] مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۲۱۹

نہ گھر میں رہنا نصیب ہوا۔ ایک جھونپڑا تھا سو خدا کا شکر ہے وہ بھی نہیں (رہا)۔ انجمن[1] ایک لٹے پٹے قافلے کی طرح پاکستان پہنچی اور کراچی آکر اطمینان کا سانس لیا۔ باوجود بے سروسامانی اور ناداری اور باوجود طرح طرح کی مشکلات کے ہم ہمت نہیں ہارے اور کچھ دنوں کے بعد انجمن نے پھر اپنا کام شروع کر دیا.........

انجمن[2] نے یہاں ایک اُردو کالج قائم کر دیا جس میں یونیورسٹی کے مضامین کی تعلیم اُردو کے ذریعے دی جاتی تھی۔ کوئی[3] رسم افتتاح کی نہ کی۔ کسی وزیر یا گورنر یا بڑے لوگوں کو نہیں بلایا۔ یہ سب ہنگامے لایعنی اور یہ سب سہارے ہیچ اور پوچ ہوتے ہیں (مجھے یقین تھا کہ) اپنا ایمان اور اللہ کا سہارا کافی ہے۔ (کالج) چلے گا تو اسی سہارے چلے گا....... الحاق[4] کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کا انتظار بھی نہیں کیا ورنہ ایک سال ضائع ہو جاتا۔ لوگ (ہمارے[5] کالج کو) آکر دیکھتے تو حیرت کرتے۔ ہم نے ایک عام اُردو کا کتب خانہ بھی قائم کر دیا جس میں (ابتداً) دس ہزار کتابیں فراہم ہوئیں اس کے افتتاح کے لیے وزیر اعظم کو تکلیف دی بڑی شان سے جلسہ کیا ایک ایڈریس کالج کی طرف سے اور دوسرا انجمن کی طرف سے پیش کیا گیا لیکن وزیر اعظم نے تحسین و تعریف تو ایک طرف، ایک لفظ بھی ہمت افزائی کا نہ کہا، امداد کی درخواست کا جواب انکار......... مرکز کا محکمہ تعلیم ہمارے کاموں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا، وہ حسد کرتا تھا۔ خود کچھ نہیں کرتا تھا، دوسرے کرتے تو انہیں کرنے نہیں دیتا تھا۔

پہلے ہی پریشانیاں کیا کم تھیں۔ یہ کالج قائم کر کے میں نے بیٹھے بٹھائے ایک پریشانی اور مول لے لی۔ کوئی یونیورسٹی اس کے الحاق کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ سندھ یونیورسٹی نے انکار کر دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کی حدودِ ارضی سے باہر تھا...... ہم ہندوستان سے لٹ پٹ

---

۱ خطبات عبدالحق صفحہ ۵۱۴ ۲ مکتوبات عبدالحق صفحہ ۳۱۴ ۳ مکتوبات عبدالحق صفحہ ۵۱۶
۴ مکتوبات عبدالحق صفحہ ۵۱۵ ۵ مکتوبات عبدالحق صفحہ ۲۱۸

کے برباد ہو کے آئے تھے، توقع تھی پاکستان ہمارے آنسو پونچھے گا اور ہمت افزائی کرے گا۔ لیکن اب جو دیکھا تو یہاں کا رنگ ہی کچھ اور تھا........ کہاں تک لکھوں بڑی طولانی داستان ہے۔

لوگ[۱] مجھے لڑاکا کہتے ہیں میں طبعاً لڑاکا نہیں لیکن حالات نے مجھے ایسا بنا دیا۔ وہاں غیروں سے لڑتا رہا یہاں اپنوں سے........ ہماری عمر یونہی لڑتے بھڑتے گزری۔ مجھے[۲] اپنے مشن میں بڑی بڑی ناکامیوں اور مایوسیوں سے سابقہ پڑا ہے۔ دنیا دارالتجربہ ہے۔ یہاں سب کچھ صبر و شکر کے ساتھ بھگتنا پڑتا ہے........ بہت کام پڑا ہے اور بہت کچھ کرنا ہے۔ بعض[۳] اوقات مجھے........ مایوسی ہونے لگتی ہے لیکن اس پر کاربند ہوں:

دست از طلب ندارم تا کام من برآید
یا جاں رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

جیسے[۴] جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے کام کا ہجوم بھی بڑھتا جاتا ہے........ میں نے حکومت سے کچھ رقمی امداد طلب کی ہے تاکہ تمام دفاتر اور عدالتی الفاظ و اصطلاحات کی ڈکشنری تیار کر دوں۔ علمی اصطلاحات جو اس وقت تک بن چکی ہیں، وہ سب جمع کر رہا ہوں انجمن اور کالج کا کام اس سے الگ ہے (خدا) یہ بیڑا ساحلِ مراد تک سلامتی سے پہنچائے۔ ہمارے[۵] تعلیم یافتہ عربی فارسی کتابوں کو مطلق قابلِ التفات نہیں سمجھتے۔ ہاں اگر کوئی یورپین یا امریکی کسی کتاب یا ہمارے کسی قدیم نظریہ کے متعلق کوئی تعریفی کلمہ کہہ دے تو وہ اُن کے لیے وحی الہام ہو جاتا ہے۔ ایسا ایک واقعہ (۱۹۵۶ء) میں انجمن کو پیش آیا۔ انجمن میں ایک جامع فہرست اُردو کتب (مطبوعہ، غیر مطبوعہ) کی تیار ہو رہی تھی۔ وزارتِ تعلیم کو امداد کے لیے لکھا کوئی توجہ نہ کی۔ خدا کا کرنا یونیسکو نے حکومت سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اپنی زبان کی کوئی ببلوگرافی ہے اور اگر نہیں ہے

۱۔ مکتوباتِ عبدالحق صفحہ ۲۲۴ ۲۔ مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۲۵۹ ۳۔ مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۲۹۵
۴۔ مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۲۲۵ ۵۔ مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۳۳۸

تو کیا وہ تیار ہو سکتی ہے۔ اب وزارتِ تعلیم والے بھاگے ہوئے ہمارے پاس آئے اور امداد دینے پر آمادہ ہو گئے اور رقم دے دی۔ یہ حال ہے ہمارے اہلِ حکومت اور قدر دانانِ علم و ادب کا!

میں نے غلام محمد صاحب سے ملنے کی کوشش کی اور نہ ایسا ارادہ تھا لیکن (۱۹۵۲ء) کی بات ہے، ایک عجیب اتفاق ہوا میں حسبِ معمول شام کو ٹہلنے کے لئے نکلتا تھا ایک دن سڑک کے کنارے پیدل پٹڑی پر جا رہا تھا اُدھر سے گورنر جنرل بہادر کی سواری آگے پیچھے جیپوں کے درمیان سڑک سے نکلی اور یکایک رُک گئی۔ گورنر جنرل اپنی کار سے اُتر کر مجھے سڑک پر سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ انھوں نے رستہ میں خود ہی انجمن کا ذکر چھیڑا اور کہا اُردو کے بنیادی اور بڑے کام بغیر حکومت کی مالی امداد کے نہیں ہو سکتے۔ میں فضل الرحمٰن (وزیرِ تعلیم) کو بلا کر اس کے متعلق کہوں گا اور بہت کچھ قسم قسم کرتے رہے، کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا...

حکومت[۲] پاکستان نے پانسو روپیہ ماہانہ میری پنشن منظور کی اور لکھا کہ یہ پنشن اُردو کی لائقِ توصیف خدمت کے سلسلے میں دی جاتی ہے۔ پاکستان کے وزیرِ تعلیم بنگالی تھے۔ اُردو نہیں جانتے تھے مگر اُردو کے سب سے زیادہ حامی یہی تھے۔ انہوں نے انجمن اور کالج کے معاملے میں ہماری بڑی مدد کی۔ انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ میری حالت سقیم ہے اور میں اب نادار ہو گیا ہوں۔ حکومت میں تحریک کر کے پنشن کرائی اور مجھ سے بہت معافی مانگی کہ میری اجازت کے بغیر انہوں نے ایسا کام کیا اور ایک ہمدردانہ خط لکھا۔ میں نے...... رقم نہیں اُٹھائی، مجھے شرم معلوم ہوتی تھی۔ یہاں پاکستان کی خدمت کے لیے آیا تھا۔ میری غیرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ میں اس کا بار رہوں اس طرف سے کئی بار تقاضا ہو چکا تھا کہ رقم اٹھالی جائے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا (کرتا بھی) تو کس برتے پر، تقدیر کا لکھا پورا ہوتا ہے یہ دن بھی دیکھنے تھے

(۱۹۵۴ء میں) جس[۳] روز مجلسِ دستور ساز میں زبان کا مسئلہ پیش ہونے والا تھا، میں ایک لاکھ اشخاص کا جلوس لے کر مئی کی گرمی میں تین میل پیدل چل کر ایوانِ اسمبلی میں پہنچا اور اس

---

[۱] مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۵۲۳ [۲] مکتوباتِ عبدالحق صفحہ ۶۰۵ [۳] مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۲۲۵

مقام پر جہاں بلا اجازت داخل ہونا ممنوع اور جرم ہے ہزاروں آدمی گھس گئے۔ پولیس اور مسلح فوج مشین گنیں اور ٹینک لیے کھڑی تھی........ سارے شہر میں کامل ہڑتال تھی۔ عاملان حکومت کا خیال تھا کہ خون خرابہ ہوگا لیکن یہ ایک ایسا پُرامن اجتماع تھا کہ سب حیرت میں رہ گئے۔ اسمبلی اجلاس برخواست کرنا پڑا اور دوسرا دن مجھ سے بات چیت کا ٹھہرا، گفتگو ہوئی، سمجھوتا بھی ہوا لیکن عمل اس کے خلاف کیا.......... جن صاحبوں کے ہاتھ اقتدار تھا اُن کو زبان، ادب، علم و تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

میری کشتیٔ عمر[۲] اب کنارے آ لگی ہے جو چاہتا تھا نہ ہو سکا، حالات سے مجبور ہو گیا اور بُرا بھلا جو کچھ کیا تھا اس پر پانی پھر گیا..... ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن زمانہ روز بروز ناساز گار ہوتا جاتا تھا، کام بن بن کے بگڑ جاتا، ساتھی ہوا کا رخ دیکھتے اور ساتھ چھوڑ بیٹھتے۔ بے وفائی اور غداری آج کل کے "شرفا" کا معمول ہو گیا ہے، پاکستان[۳] آنے کے بعد قلب ماہیت ہو گئی ہے۔ اچھے گھرانے کے شریف لوگ اب یہاں ایسی کمینہ اور رذیل حرکتیں کرنے لگے ہیں کہ حیرت اور شرم معلوم ہوتی ہے۔ مجھے ایسی باتوں سے روزانہ سابقہ پڑتا ہے۔

میں[۴] نے یہاں آکر پانچ رسالے جاری کئے تھے......... ان میں سے تین[۵] رسالے (معاشیات، سائنس، تاریخ و سیاسیات) ناقدری کی بدولت بند کرنے پڑے۔ اب "اردو" اور "قومی زبان" رہ گئے ہیں، یہ بھی سسک رہے ہیں۔ "اردو" پرانا رفیق ہے، خدانخواستہ اگر اسے بند کرنا پڑا تو اس کا صدمہ شاید برداشت نہ کر سکوں، انجمن[۶] کے حالات کچھ ایسے درہم برہم ہو گئے تھے جس کی توقع نہ تھی اس خیال سے کہ روزمرہ کے انتظامی جھگڑوں، حسابات اور پریس وغیرہ کی نگرانی سے نجات مل جائے اور میں ایک دو ادبی کام جو ادھورے پڑے ہیں پورے کر سکوں، جدید سیکرٹری، جائنٹ سیکرٹری کا انتخاب کرایا۔ نئے خازن کا بھی انتخاب ہوا۔ میں سمجھا اب کام

---

[۱] مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۴۰۰ [۲] مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۶۲۲ [۳] مکتوباتِ عبدالحق صفحہ ۳۴۱
[۴] مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۴۰۰ [۵] مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۴۰۱

اطمینان سے چلے گا اور مجھے بھی فرصت مل جائے گی، مگر معاملہ برعکس نکلا۔ ان صاحبوں نے غلط پروپیگنڈہ اور سازش سے مجلسِ نظما میں اپنی اکثریت بنالی اور تخریبی کارروائیاں شروع کردیں چونکہ سب اختیار ان کو حاصل ہو چکے تھے، اُلٹی سیدھی جو چاہتے کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالات ابتر ہو گئے۔ میرے پاس علم و ادب، اصطلاحات و لُغات کا ڈھیر رکھا تھا لیکن اشاعت کے لیے روپیہ نہیں تھا (انجمن[1]) ایسے نااہل، تخریب پسند غدّار اشخاص کے ہاتھ میں آگئی تھی جو علم و ادب سے بے بہرہ تھے، سارا روپیہ برباد کر دیا اور کام صفر۔ یہ حالت زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی تھی۔

مجھے[2] اس زمانے میں جو تکلیف اور روحانی کوفت ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ ہماری قوم ایک عجیب قوم ہے اس میں وہ تمام عیوب موجود ہیں جو ایک پس ماندہ اور زوال آمادہ قوم میں ہوتے ہیں۔ ہمارے بھائی اپنے کسی بھائی کو آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے اور جو علی الرغم ان کے آگے بڑھ گیا ہے اُسے گرانے اور رُسوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میرے[3] قدیم ساتھی اور رفیق ایک ایک کرکے سب رخصت ہو گئے اور میں اکیلا ان کا ماتم کرنے اور پاکستان میں ٹھوکریں کھانے کے لئے رہ گیا ...... ضعفِ بصارت کی معذوری اور انجمن کی الجھنوں کی وجہ سے (مجبوری) بڑھتی جاتی تھی، کم ہونے کو نہیں آتی تھی۔ حریفوں کے دماغ تخریبی جدتوں سے مالا مال تھے ...... اُنھوں نے مجھے اذیت پہنچانے اور رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ یہ لوگ صاحبِ اقتدار بھی تھے اور صاحبِ ثروت بھی، ایک شیطانی لشکر ان کے ساتھ تھا جس کا شغل پروپیگنڈہ تھا۔ اس کام پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے۔ یہ روپیہ کہاں سے آتا تھا، اُس تعلیمی ادارے سے جو میں نے بڑے شوق سے قائم کیا تھا۔ جب اسے لوٹ لوٹ کر کھوکھلا کر دیا تو آپس میں پتی ڈال کر ہزاروں روپے رشوت میں اُن عمّال کو دیتے جو رعایا کے محافظ سمجھے جاتے تھے تاکہ وہ ہم پر الزامات قائم کرکے ہمیں بدنام کریں

---

[1] مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۵۴۵ [2] مکتوباتِ عبدالحق صفحہ ۲۰۴ [3] مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۲۰۴

اب جو باوجود تمام شرارتوں، پروپیگنڈے اور رشوت کے انہیں اپنی مہم کچھ ناکام سی نظر آنے لگی تو انہوں نے مصالحت کے نام سے نیا شوشہ چھوڑا — ہم نے اور خاص کر ہمارے تعلیم یافتہ گروہ اور قدیم سول سروس والوں نے انگریزوں سے بہت سی بُری بھلی باتیں سیکھی ہیں اُن میں ایک COMPROMISE ہے۔ انگریز کی زندگی سراسر COMPROMISE ہے۔ اس کی سیاست، اس کی تجارت، اس کا مذہب اور اس کا اخلاق، اس کے باہمی اور بین قومی تعلقات، یہاں تک کہ اس کے زن وشو کے تعلقات بھی COMPROMISE پر مبنی ہیں....

.......اس[1] مفاہمت یا مصالحت .... کی تہہ میں یہ بات تھی کہ اُن کی بداعمالی پر پردہ پڑا رہے۔ میں نے بار بار انجمن، کالج اور پریس پر تحقیقاتی کمیشن قائم کرنے کی تجویز کی مگر وہ کبھی اس طرف مائل نہیں ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر تحقیقات ہوئی تو اِن بدکاروں کی بداعمالیاں آشکارا ہو کر رہیں گی اور یہ اُنہیں منظور نہیں تھا۔ یہ (تحریر[2]) میں نے تلافیٔ مافات کے خیال سے اٹکل سے گھسیٹ کر لکھی ہے۔ اگر اس میں کوئی بے ربطی یا غلطی نظر آئے تو یہ سمجھ کر معاف (کر دیا جائے) کہ یہ ایک ایسے مظلوم شخص کی تحریر ہے جس نے کام کو ایمان سمجھ کر کیا، پر افسوس کہ اب کام رہا اور نہ ایمان رہا:

عیب نکلا، جو ہنر پیدا کیا

ہم نے کھویا، جس قدر پیدا کیا

سالہا[3] سال کی محنت دلّی میں آزادی کی نذر ہو گئی تھی اس کا صدمہ ایسا تھا کہ نہ بھلا سکا۔ جب یہاں قدم اچھی طرح جم گئے تو میں نے پھر کام شروع کر دیا، تنہا تھا، کوئی مددگار نہیں تھا۔ اتنی مقدرت نہ تھی کہ مدد کے لیے کسی ملازم کو رکھ لیتا۔ انجمن کی مالی حالت بھی سقیم تھی۔ کئی سال تک دن رات کام کرتا رہا .... میرے رفقائے کار نے مجھے ایسی اذیتیں پہنچائیں اور انجمن کو ایسے نقصانات پہنچائے کہ میں کسی کام کا نہ رہا۔ میرا کتب خانہ تک سر

---

[1] مکتوبات عبدالحق صفحہ ۴۰۵ [2] مکتوبات عبدالحق صفحہ ۴۰۶ [3] مکتوبات عبدالحق صفحہ ۲۲۹

بمہر کر دیا۔ میرے مسودات سب کتب خانے میں بند رہ گئے۔ سازشوں کا بازار گرم ہو گیا خیانت اور بددیانتی پر پردہ ڈالنے کے لئے طرح طرح کی الجھنیں پیدا کر دیں۔۔۔۔۔۔۔۔

نیا انقلاب آیا تو خائن اور بددیانت گھبرائے، سازشوں کا زور کم ہوا۔ اسی کے ساتھ حکومت نے ترقی اُردو بورڈ قائم کیا اور لغت کی ترتیب کے لئے مجھ سے درخواست کی۔ میں نے بخوشی اس کام کو اپنے ذمے لے لیا۔ یہ بھی اجازت دی کہ اپنی پسند کے مددگار وغیرہ انتخاب کر لوں۔ اللہ نے چپ کی داد دی اور صبر کا پھل ملا۔ انشاءاللہ اب کام پوری مستعدی کے ساتھ شروع ہو جائے گا اور گزشتہ آفات کی تلافی ہو جائے گی۔!

⑤

اُردو یونیورسٹی[1] کی تجویز کی جس طرح تائید و حمایت کی گئی تھی اس کو دیکھتے ہوئے مجھے پورا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں یہ یونیورسٹی قائم ہو کر رہے گی لیکن اس کے بعد ہی بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے اتنا موقع نہ دیا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا، یہاں تک کہ نوبت تقسیم ملک تک پہنچ گئی اور سارے ارادے دل کے دل میں رہ گئے۔ لیکن اس کے باوجود ابھی اُمید کی ایک کرن باقی تھی اور بجھی ہوئی راکھ میں ایک چنگاری روشن تھی کہ اگر ہندوستان میں ناگ پور کی تجویز عمل میں نہ آسکی تو پاکستان میں تو اسے عمل میں لانے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے گی۔ جب[2] میں نے دلّی میں قائداعظم سے اُردو یونیورسٹی کے قیام کے بارے میں گفتگو کی تھی تو انھوں نے اس سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور مجھے قوی اُمید تھی کہ میں اُن کی امداد و اعانت سے کراچی میں اُردو یونیورسٹی کے قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا لیکن اس وقت خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ قائداعظم ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئے اور ان کے بعد ہماری بدنصیبی سے زبان کا طے شدہ مسئلہ بھی ایک نزاعی مسئلہ بن گیا اور پھر خود غرض اور مفاد پرست سیاست

---

[1] اُردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضا صفحہ ۲۲ [2] اُردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضا صفحہ ۲۴

کاروں کی بدولت اس نے ایک "فتنۂ بیدار" کی شکل اختیار کر لی لیکن میں اس وقت بھی مایوس ہوا اور میں نے اللہ کا نام لے کر اسی کراچی میں انجمن ترقی اُردو پاکستان کے زیر اہتمام اُردو کالج قائم کیا جو خدا کے فضل و کرم سے اب بھی کامیابی سے چل رہا ہے اور جس میں بی۔اے، بی۔ایس سی، بی۔کام اور ایل ایل بی تک اُردو کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی ہے اور اب سے چند سال پہلے ایم اے کی تعلیم بھی اس میں اُردو کے ذریعے سے دی جاتی تھی۔[1]

موجودہ انقلابی حکومت کے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن نے بھی انجمن کے اُردو کالج میں قومی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے کامیاب تجربے کا اعتراف کیا اور اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ تجربہ جاری رہنا چاہیے — یہ سچ[2] ہے کہ میں اپنی عمر کی نوّے منزلیں طے کر چکا ہوں لیکن میرے ارادے اب بھی جوان ہیں اور میرا عزم و حوصلہ اب بھی زندگی کی حرارت سے سرشار ہے میرے سامنے ایک مقصد ہے اور اس مقصد کی تکمیل ہی میری زندگی کا حاصل ہے اور وہ مقصد ہے جلد سے جلد کراچی میں ایک چارٹرڈ اُردو یونیورسٹی کا قیام۔ میں[3] اب زندگی کی اس منزل میں ہوں جہاں کام سے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اُردو یونیورسٹی کا قیام اب میری زندگی کا مشن ہے اور اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں، چاہے مجھے اس سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے۔

پچھلے[4] ایک دو سال کے عرصے میں ہند و پاک کے بعض رسالوں نے میرے بارے میں نمبر شائع کیے۔ ان میں "الشجاع"، "نورس" کراچی اور "مجلس" دکن، شامل ہیں۔ جلد ہی اُردو کالج، کراچی کی طرف سے بھی ایک خاص نمبر "(برگِ گل)" شائع ہو رہا ہے جو کم و بیش بارہ سو صفحات پر مشتمل ہے .... ان سب کے پڑھنے سے (ناظرین) کو میرے متعلق بہت کچھ معلوم ہو جائے گا (دیکھیے)، مجھے اپنے حال کے متعلق حالی

---

[1] اُردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضا، صفحہ ۲۷ [2] اُردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضا، صفحہ ۲۸
[3] مکتوباتِ عبدالحق، صفحہ ۲۷۰ [4] رسالہ "نورس" کراچی، صفحہ ۱۶۷

کی ایک رُباعی یاد آتی ہے:

جیسا نظر آتا ہوں، نہ ایسا ہوں میں
اور جیسا سمجھتے ہیں، نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی، عیب ہوں چُھپاتا اپنے
بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں!

اِشاریۂ کتاب :

اسماء الرجال

اسماء الکتب

اخبارات و رسائل

دکن ریویو، اپریل ۱۹۰۸ء : ۶۹ -

جون ۱۹۰۸ء : ۶۹ -

ستمبر ۱۹۰۸ء : ۶۹ -

مئی ۱۹۰۹ء : ۶۹ -

سائنس : ۴۵ ، ۷۶ ، ۲۰۲ -

صدقِ جدید، دریاباد، لکھنؤ، ۲۱ مئی ۱۹۶۵ء : ۱۳ ، ۲۴ -

علی گڑھ میگزین : ۳۴ -

قومی زبان، کراچی : ۱۹ ، ۷۶ ، ۲۰۲ -

قومی زبان، کراچی، ۱۶ اگست ۱۹۶۰ء : ۱۷۱ ، ۱۷۲ -

قومی زبان، کراچی، ۱۶ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء ۱۷۶ ، ۱۷۷ ، ۱۷۹ ، ۱۸۰ ، ۱۸۱ -

قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۴ء : ۱۳ -

مارننگ نیوز، کراچی : ۷۵ -

مجلس، حیدرآباد دکن، اکتوبر ۱۹۶۰ء تا جنوری ۱۹۶۱ء : ۱۶ ، ۳۲ ، ۳۸ ، ۵۵ ، ۶۱ ، ۷۳ تا ۷۵ ، ۷۹ ، ۸۰ ، ۸۴ ، ۹۰ ، ۹۶ ، ۹۸ ، ۹۹ ، ۱۱۰ ، ۱۱۶ ، ۱۱۷ ، ۱۲۱ ، ۱۲۲ ، ۱۲۷ ، ۱۲۸ ، ۱۳۴ ، ۱۳۷ ، ۱۳۸ ، ۱۳۹ ، ۱۴۱ ، ۱۴۷ ، ۱۵۰ ، ۱۵۲ ، ۱۵۵ ، ۲۰۶ -

مخزن، لاہور : ۳۸ -

معاشیات : ۷۶ ، ۲۰۲ -

نقوش، لاہور، آپ بیتی نمبر ۱۹۶۴ء : ۱۹ -

نقوش، لاہور، مئی ۱۹۶۵ء : ۲۸ -

نگارِ پاکستان، کراچی : ۱۳ ، ۲۷ -

نگارِ پاکستان، کراچی، اپریل ۱۹۶۵ء : ۲۴

نورس، انجمن باغ اسکول، کراچی، جولائی ۱۹۶۰ء : ۱۶ ، ۱۹ ، ۴۰ ، ۵۲ ، ۵۷ ، ۶۳ ، ۶۴ ، ۷۸ ، ۱۲۴ ، ۱۳۲ ، ۱۳۹ ، ۱۴۰ ، ۱۴۱ ، ۱۶۶ ، ۱۷۱ ، ۱۸۶ ، ۲۰۶ -

نورس، مجلۂ عثمانیہ کالج اورنگ آباد، ۱۹۳۰ء : ۱۵ ، ۳۵ ، ۴۰ ، ۴۶ ، ۶۲ ، ۱۰۳ ، ۱۰۸ ، ۱۴۲ -

ہماری زبان، دہلی : ۷۶ -

ہنس : ۱۳۰ -

○

ادارے، انجمنیں، مطابع، کتب خانے

اماکن

بابائے اُردو کی حیات اور خدمات پر ہماری

چار اہم کتابیں

○

۱- ذکرِ عبدالحق : ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن ۱۵ روپے

۲- نقدِ عبدالحق : ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن ۲۴ روپے

۳- فرموداتِ عبدالحق : ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن ۱۵ روپے

۴- بابائے اُردو : احوال وافکار : ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن ۱۵ روپے

○

سنگِ میل پبلی کیشنز ، چوک اُردو بازار ، لاہور

سیّد مُعین الرحمٰن صاحب مُدّتوں بابائے اُردو کے رفیقِ کار رہے ہیں۔ بابائے اُردو کے کام اور شخصیت اور خدمات سے متعلق اُن کی یہ کتاب قابلِ قدر ہے اور مولوی عبدالحق مرحوم کے ہر قدر شناس کے ہاتھ میں جانے کے لائق۔

——— مولانا عبدالماجد دریابادی

"بابائے اُردو - احوال وافکار" کو دیکھا۔ ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن صاحب نے ادب کا ایک بیش قیمت کارنامہ انجام دیا، بالخصوص "آپ بیتی" خوب ہے، نہایت اہم اور نہایت مفید۔

——— ڈاکٹر غلام مُصطفٰی خاں

"بابائے اُردو - احوال وافکار" بے حد دلچسپ ترتیب و تالیف ہے۔ بابائے اُردو پر بہت کچھ آچکا ہے لیکن اس کتاب کی بلاشبہ ایک خاص اہمیت ہے۔ مولوی صاحب قبلہ کے بارے میں معاصر راویوں کا یہ "اشاریہ" تحقیق کنندگان کی رہنمائی کا کام دے گا۔

——— ڈاکٹر محمّد طاہر فاروقی

سیّد مُعین الرحمٰن صاحب کے علمی و ادبی انہماک سے بڑا جی خوش ہوتا ہے، خصوصاً بابائے اُردو پر ان کا یہ کام مجھے بہت پسند آیا معین صاحب اس کتاب کے ذریعے مولوی صاحب کی روح کو سامنے لے آئے ہیں اور اسی لیے یقین ہے کہ ان کا یہ کام مولوی صاحب کے دوست دشمن دونوں میں بہ نظرِ استحسان دیکھا جائے گا اور آئندہ کام کرنے والوں کو اس سے روشنی نصیب ہوگی۔

——— ڈاکٹر فرمان فتح پوری